زبانِ اردو

پر

سرسری نظر

فہرست مضامین

تعارُف

گزشتہ اجلاس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے موقع پر مسٹر رشید احمد صاحب صدیقی ایم اے لکچرار مسلم یونیورسٹی نے زبانِ اُردو پر جو لکچر دیا تھا اُس کا ان صفحات میں جدید تہذیب و ترتیب کے ساتھ اعادہ کیا گیا ہی۔ صدیقی صاحب کی تحریر میں جو "سنجیدہ شوخی" اور "ورنجنیلیٹی" ہوتی ہی وہ محتاج بیان نہیں۔ یہ خصوصیات اس لکچر میں بھی قائم ہیں۔ اُنھوں نے اپنے انداز خاص میں (اور اس لکچر کے لئے رات کا جو نہایت محدود وقت تھا اُس کے اندر) زبان اُردو کی مختصر تاریخ، اس کی خصوصیات، اس کے دعایم وارکان، اُس کی زود آموز و عام فہم ساخت، اس کی موجودہ حالت اور آیندہ ضرورت، اس کی ادبی ولسانی حیثیت، کل ہندوستان پر اُس کے جایز حقوق اور اس کے وجوہ غرض سب کچھ بیان کر دیا ہی۔ اور پبلک کو اس لکچر کے ذریعہ سے جو مژدہ ملے گا وہ مسلم یونیورسٹی میں اُردوئے معلّٰی کے قیام و اجرا کی تجویز ہے جو عمل میں آ چکی ہی۔

لکچر ہوں کہ خود کچھ زیادہ طویل نہیں ہی اس لئے اس کی نسبت اس سی زیادہ کچھ اور کہنا یقیناً طول مُمل کا ہم معنی ہو گا یقین ہے کہ ناظرین اسے پورے شوق کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں گے۔

محمد مقتدیٰ خاں شروانی

علی گڑھ:
۲۹ اپریل ۱۹۲۴ء

لکچر نمبر ۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زبانِ اُردو

(رشید احمد صدیقی ام اے (علیگ) لکچرر (اردو) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

جنابِ صدر، بزرگان محترم اور عزیزان یونیورسٹی،

سنّتِ دیرینہ

جس مبحث پر مجھے اظہار خیال کا موقع دیا گیا ہے وہ "زبانِ اُردو" ہے۔ یہ موضوع جتنا وسیع اور دقیع ہے اُس کا مجھے کامل احساس ہے، اگر یہ محض رسمیات کی ایک فرمودہ سنت نہ تصور کی جائے تو میں عرض کرونگا، یہ فریضہ میری بساطِ فہم و فراست سے کہیں وسیع اور بسیط ہے لیکن اگر میری پُرخلوص مساعی اور وائس چانسلر صاحب بالقابہ کا بزرگانہ فرمانِ ناطق میرے لیئے سندِ جواز کی حیثیت رکھ سکتا ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں میں کوشش کرونگا، حتی الوسع آپ کی توقعات مایوس نہوں۔ میں جانتا ہوں میرا یہ عرض کرنا میرے "برخود غلط" ہونے کی ایک تاریک مثال ہے لیکن کیا کروں اظہار انکسار کی فرسودگی اس سے بھی زیادہ بے کیف ہوتی ہے اور میرا عقیدہ ہے، ہر اجتہاد یا انحراف خواہ وہ کتنا ہی بے محابا کیوں نہ ہو، اُن پامال رسمیات سے زیادہ دلکش ہوتا ہے جن کی سننے کا ایک ذہین مجمع پہلے سے متوقع ہوتا ہے اور مقرر کے متعلق ایسی رائے قائم کرلیتا ہے جو اس کے لیئے کچھ زیادہ امید افزا نہیں ہوسکتی۔ ایک دوسری دقت میرے لیئے یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ملک و قوم کی جیسی کچھ حالت ہے اور آراء و افکار

میں جیسا کچھ تصادم ہے، اس اعتبار سے مضمون زیرِ بحث کچھ زیادہ دلچسپ نہیں رہ جاتا۔ سیاسی شورشیں اور جماعتی نوک جھونک جس کا مقصد "خوباں" کے "چھیڑنے" سے ہو گرمیِ محفل کے لیئے ضروری ہے۔ ہم میں بہت سے لوگ "گرمیِ بزم" کے جویا ہوتے ہیں، اس سے بحث نہیں وہ "رقصِ شرر" تک کیوں نہو، لیکن محض اس خیال سے کہ آپ حضرات نے کانفرنس میں شرکت فرمائی ہے میں یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ "زاہدِ شب بیدار" کی ناقابلِ رشک حیثیت کو کچھ اور نہیں تو محض "تبرّکاً" و "تیمناً" گوارا فرمانے کے لیئے تیار ہیں۔ اس مختصر تمہید کے بعد اور یہ تمہید صرف ایک دلکش اعترافِ شکست ہوتی ہے، میں نفسِ مضمون کی طرف مائل ہونے کی دعوت دیتا ہوں۔ میں دورانِ تقریر میں اکثر ایسا ہی کرتا رہونگا اور یہ محض اس لیئے نہو گا کہ آپکے خیالات میں جو بہت ممکن ہے مضمونِ زیرِ بحث سے بالکل غیر متعلق ہوں، میں کسی طور پر مخل ہوں بلکہ یہ خود اپنے ہی خیالات کو مجتمع کرنے کا ایک آسان وسیلہ ہوگا !

حضرات ! اُردو کا سوال کسی نہ کسی صورت میں معرضِ بحث میں رہا ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے ہر نقطۂ نگاہ سے اس پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ لیکن پچھلے چند سالوں سے حالات و واقعات کچھ اس طرح رونما ہوئے ہیں کہ ہمکو اب جلد سے جلد فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ اس مسئلہ میں ہماری دیرینہ سعی و کاوش کا عملی پہلو کیا ہونا چاہیئے۔ زبانِ اُردو کی ابتدا اور ارتقا پر تاریخی نقطۂ نظر سے بحث کرنیکی کچھ زیادہ ضرورت نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ اول تو میں اسے ایک خالص ادبی مبحث قرار دینا نہیں چاہتا کیونکہ یہ مسئلہ عرصہ ہوا ان مراحل سے گزر چکا، دوسرے یہ کہ فی الحال اس کا کوئی موقع نہیں ہے۔ گفت و شنید کا وقت ختم ہو چکا ہے، نقل و حرکت کو ختم کرنا چاہیئے۔ اب حملہ اور مدافعت کا وقت ہے اور ہم کو اس کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ ہندوستان اس وقت جن مراحل سے گزر رہا ہے، اس کا آپ کو احساس ہے، لیکن مجھے اندیشہ ہے، بہت سے اصحاب ان نتائج کا اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں جو جلد یا بدیر پیش آنیوالے ہیں۔ مسئلہ زیرِ بحث کا سب سے زیادہ دشوار پہلو تو یہ ہے کہ اُردو محکوم قوم کی زبان ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ مشکل یہیں ختم نہیں ہو جاتی اُردو کی حریف صرف حکمراں ہی قوم کی زبان نہیں ہے بلکہ وہ ان لوگوں کی معاندانہ تگ و تاز کی بھی آماجگاہ ہے جو ہماری طرح محکوم ہیں گو مشترک مصیبت حریفوں کو بھی دمساز بنا دیتی ہے۔ لیکن وہ کلّیہ ہی کیا جو مستثنیات سے خالی ہو !

حضرات ! جیسا آپ پر روشن ہے اُردو شاید تمام دُنیا کی زبانوں سے نو عمر ہے، اس کے آغاز اور ترقی پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اُردو دُنیائے ادب کا ایک محیّر العقول کرشمہ ہے۔ زبانیں قرنوں میں بنتی ہیں۔ الفاظ کا سرمایہ صدیوں میں فراہم ہوتا ہے، اور صدیوں تک اُن پر سال و سنین کا انبار فراہم ہوتا ہے اس وقت کہیں جا کر یہ منتشر ذرّات آپس میں ایک دوسرے سے پیوست ہو کر جواہر ریزے بنتے ہیں۔ ادبیات کی مثال حجریات کی ہے۔ خاک اور ریگ کے یہی حقیر اور منتشر ذرّات ہزاروں لاکھوں سال تک جذب و تجاذب کے فشار میں مبتلا رہتے ہیں اور آخر میں سنگلاخ بنجاتی ہیں۔ لیکن کیا یہ حیرت انگیز نہیں ہے کہ نسبتاً نہ ہمیں اُردو اپنی پوری استعداد اور انتہائی

رعنائی کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہیں دوسرے بو العجبی بھی ملاحظہ ہو۔ اکثر زبانوں کا عروج اور اُن کی ابتدا حکمرانوں کے قوت بازو یا اُن کی اعانت اور تصرّف کی رہین منت رہی ہے۔ اُردو نے آنکھ کھولی تو اس کے سرپرستوں کی سطوت جنازہ بر دوش تھی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اُردو لشکری یا اس کے بعد درباری زبان رہی اور اس میں وہ تمام نقائص موجود ہیں جو ایسی زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں اُردو کی ابتدا اور ارتقا سے بحث نہیں ہے، سوال یہ ہے کہ جن حالات کے ماتحت اُردو نے موجودہ شکل اختیار کی ہے کیا وہ حیرت انگیز نہیں ہیں یوں تو کہنے کے لیئے اُردو کی تاریخ ترکوں اور مغلوں ہی کے وقت سے نہیں بلکہ اس سے کئی صدی پیشتر عربوں کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن ان تاریخی موشگافیوں سے قطع نظر کر لیا جائے تو یہ بیان واقعہ ہے کہ اُردو کو موجودہ صورت اور حالت اختیار کیئے ہوئے کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا ہے اُردو کا وہ سرمایہ جسے بجا طور پر ادبی کہا جا سکتا ہے زیادہ سے زیادہ سو سال کا ہے۔ غدر کے کچھ پہلے سے شروع ہو کر اب تک اس نے جتنے مدارج ترقی طے کیئے ہیں اس کا مشکل اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ساٹھ ہی ستر سال کے اندر اندر اس کے سرپرستوں نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا اس حقیقت سے تصور کیا جا سکتا ہے کہ کوئی صنف کلام ایسی نہیں ہے جس کا بہتر نمونہ اُردو میں نہ موجود ہو۔ کچھ لوگ اُردو پر تہی مایہ ہونے کا الزام عائد کرتے ہیں۔ ان کو نہیں معلوم، کسی مخصوص زبان کی جامعیت کا یوں اندازہ لگانا کہ اس میں کس کس قسم کی اور کس تعداد میں تصانیف موجود ہیں، صحیح نہیں ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس میں استعداد قبولیت کہاں تک ہے۔ اُردو کی استعداد اور ہمہ گیری پر حرف نہیں لایا جا سکتا۔ کمی انشا پردازوں کی ہے، زمانہ کی نامساعدت ہے، حکومت کی بے اعتنائی ہے، ہندوستانیوں کا تعصب اور جہالت ہے، اور ہماری بے توجہی ہے!

حضرات، اُردو کے متعلق تو کہا جا سکتا ہے "کے آمدی و کے پیر شدی" خود فارسی کو لے لیجئے۔ کب سے عالم وجود میں ہے کیسی کیسی سرپرستیاں نصیب رہی ہیں کہاں کہاں سے فیض حاصل کیا ہے۔ لیکن کس سرمایہ کی مالک ہے؟ یہاں بھی صرف شعر و سخن ہی کا عنصر غالب نظر آئیگا۔ اُردو پر بھی تو بعض حضرات یہی الزام دھرتے ہیں کہ یہاں شعر و شاعری کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ اس اعتراض کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو صورت حال میں کیا فرق آتا ہے۔ اُردو کا اگر فارسی سے مقابلہ کیا جائے تو ادبی حیثیت سے ان دونوں میں کچھ زیادہ فرق نظر نہیں آئیگا۔ اس میں شک نہیں فارسی شعرا، شعر و سخن میں عربوں کے علاوہ تمام دنیا کو دعوت جنگ دیسکتے ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت ظاہر ہو جائے گی فارسی کو فی الحال جیسی کچھ حیثیت حاصل ہے اس میں اسلام اور عربوں کا تصرف غالب اور نمایاں ہے برخلاف اس کے عربی شاعری خوشہ چینیوں سے بالکل پاک نظر آئیگی ایام جاہلیت کی شاعری اس وقت تک کلاسکس میں شمار ہوتی ہے عرب کا لق و دق ریگستان، شعلہ بار ہوائیں

خانماں برد وحشی بدوی، جن کا ضابطہ انصاف صرف اُن کی تلواروں کی بُرّش، جن کا صحیفہ اخلاق مہمان پرستی، جن کے محسوسات شعری اونٹ اور بکری، اور جن کا سارا سرمایہ حیات فطرت کا مظہر خشن و خشونت تھا، شاعری کے میدان میں اس شعلہ نوائی سے کام لیتے تھے کہ قلوب کی انتہائی گہرائیاں بھی ملتہب ہو جاتی تھیں۔ وہ جاہل تھے لیکن دنیا کو گونگا جانتے تھے۔ خیال کرنے کی بات ہے اُنھوں نے یہ دعویٰ اُس وقت کیا تھا جب دنیا کی دیگر زبانیں معراج کمال پر پہنچ چکی تھیں۔ پھر یہ ادعائے باطل نہ تھا، اُن کی جاہلیت کے کلام سے متمدن قوموں کے بہترین کلام کا مقابلہ کر لیجئے۔ اور مقابلے کیئے گئے ہیں۔ میدان صرف نیم وحشیوں کے ہاتھ رہا ہے۔ یہ موقع عرب شاعری کی منقبت کا نہیں ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ کسی زبان کی جامعیت کا مدار صرف اس حقیقت پر نہیں ہے کہ وہاں کی آب و ہوا کیسی ہے، نظام تمدن میں کیا خوبیاں ہیں، ادبیات کا ذخیرہ کیا ہے، اگر یہ امور قابل پذیرائی ہو سکتے تو باوجود ان تمام خوبیوں کے سنسکرت مردہ زبان نہ تصور کی جاتی۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ کس زبان میں کس حد تک جذب و تجاذب کی استعداد ہے کون زبان زمانہ کی ضروریات کی کفیل ہو سکتی ہے اور کون سی زبان زمانہ کے فشار اور دست بُرد سے محفوظ رہ سکی ہے۔

بساطِ نو

حضرات، جہاں تک ادب متین کا تعلق ہے، سوائے چند اخلاقی تصانیف کے جن میں بیشتر ام الالسنہ سے خوشہ چینی کی گئی ہے یا چند تاریخی تذکروں کے جو زیادہ تر شعرا کے شاعرانہ حالات زندگی پر مشتمل ہیں اور وہ بھی جامع و مانع نہیں۔ فارسی ادب صرف شعر و شاعری کا حامل ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ فارسی شعرا اس کی اہلیت نہیں رکھتے تھے یا ان میں اس کی استعداد نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں کہیں بادشاہ وقت حکمراں مطلق ہوگا، وہاں دربار کی رضا جوئی کے لیئے ہر شخص کی طبیعت شعر و سخن کی طرف ملتفت ہو گی۔ جہاں قصیدہ گوئی ہی آذوقہ حیات اور نام و نمود کے لیئے ضروری ہو، وہاں کوئی شخص کسی دوسرے طرف کیونکر مائل ہو سکتا ہے اس کی بہترین مثال خود ہماری زبان اُردو ہے۔ جب تک دہلی، لکھنؤ یا دیگر درباروں سے شعرا کی پرستش ہوتی رہی قصیدہ گوئی یا ہزل سرائی کا بازار گرم رہا۔ اب بھی جہاں کہیں یا کسی ریاست میں درباری شعرا کا انسٹی ٹیوشن ہے، وہاں سوائے قصائد یا غزلیات کے آپ کچھ اور نہ پائینگے۔ ریاستیں دربار شاہی کے چھوٹے نمونہ ہیں۔ قاآنی ایسا جامع الصفات شاعر بھی محض درباری شاعر ہونے کی حیثیت سے اپنا پورا زور قلم صرف قصائد پر صرف کرتا ہے حالانکہ یہ وہ شاعر ہے جو نیچرل شاعری میں یگانۂ روزگار ہو سکتا تھا۔ اب بھی جہاں کہیں اس نیچرل رنگ اختیار کیا ہے یکتائے عصر ہو گیا ہے۔ بہر حال دہلی اور لکھنؤ کی محفلوں کا درہم برہم ہونا تھا کہ شعرا نے اپنی سعی و کاوش کو دوسری طرف مائل کیا۔ اُردو ایک حد تک ۱۸۵۷ء کے فتنہ آشوب تک مکمل ہو چکی تھی۔ اس کے بعد زمانہ نے ایک نئی بساط بچھائی

قصائد، مرثیے میں بدل گئے، غزلیں نوحہ خوانی میں تبدیل ہو گئیں۔ ذوقِ شعری نے ادبی اور سنجیدہ رنگ اختیار کرنا شروع کیا، غور کرنے کا مقام ہے یہ رنگ کب نمایاں ہوتا ہے؟ جب "بادۂ شبانہ کی سرمستیاں" ختم ہو چکی تھیں اور "لذتِ خوابِ سحر" کافور ہو چکی تھی!

حضرات! زبانیں جس طور پر ترقی کرتی ہیں زمانہ کا اُن پر اور اِن کا زمانہ پر جیسا کچھ اثر پڑتا ہے اس سے آپ کم و بیش واقف ہیں، اُردو کا گہوارہ شیراز ہند (برج کا مرغزار) تھا۔ ہر نئی آنے والی نسل کا جولانگاہ شمالی ہند رہا ہے اور جغرافیائی نقطۂ نگاہ سے برج کو جو مرکزی حیثیت حاصل تھی اس کا اقتضا تھا کہ جتنی قومیں ہندوستان میں وارد ہوتیں فطرت کے اس حسن کدہ پر ضرور حاضر ہوتیں، اور یہی وجہ ہے کہ دیگر علاقوں سے سوا یہاں کی زبان پر ان کا اثر پڑا اور اس کا دامن مختلف زبانوں کا مینا بازار بن گیا۔ فاتحین آتے رہے قومیں بنتی بگڑتی رہیں، زمانہ لیل و نہار کی کروٹیں لیتا رہا۔ یہاں تک کہ شاہ جہاں نے دنیائے آب و گل میں آنکھ کھولی اور اُردو بھاشا نے اُردوئے معلّیٰ کا خلعت پہن لیا۔ میں نے اُردو کی ابتدائی ارتقائی منازل کو بضرورت نظر انداز کیا ہے اور اس وقت بھی میں الفاظ، اشعار، بیان اور معانی کی مثالیں آپ کے سامنے پیش کرنا نہیں چاہتا، اس پر کافی بحث ہو چکی ہے اور جن اصحاب کو اُردو سے مناسبت اور دلچسپی رہی ہے وہ اس کی ابتدائی منازل سے کم و بیش واقف ہیں۔

غدر اور غالب

میں فی الحال ان واقعات سے بحث کرنا چاہتا ہوں جو ہم میں سے بہت سے اصحاب کے مشاہدہ میں آئے ہونگے۔ ہم میں ابھی وہ نفوسِ قدسیہ بھی موجود ہیں جنہوں نے غدر کا ہنگامہ رستخیز اور ساتھ ہی ساتھ غالب، داغ، سر سید، محسن الملک، سجاد حسین، آزاد حالی، شبلی اور اکبر کی اعجاز بیانی اور شگفتہ نگاری کا زمانہ دیکھا ہے یہ شمعیں غدر کے بعد گل ہوئی ہیں۔ زمانہ کا انقلاب نظم و نثر کے آئینہ میں دیکھنا ہو تو ان کے کلام کا مطالعہ کیجئے۔ میں اس مثال کے واضح کرنے کے لئے صرف تین ہستیوں کو پیش کرونگا، سب سے اوّل غالب کا نام لیتا ہوں، کچھ لوگ غالب کے کلام کو وید مقدس کا پایہ دیتے ہیں، دوسرے اُن کو مہمل گو تصور کرتے ہیں۔ کسی کلام کے الہامی ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اسے مہمل کہا جائے۔ لیکن اس حقیقت کو نظر انداز بھی کر دیا جائے پھر بھی غالب کے ایک بلند پایہ شاعر ہونے میں کلام نہیں ہے اور اس میں شک نہیں کہ غالب اور انیس ان بلندیوں پر پہونچ چکے ہیں جہاں تک مشکل کسی اور اُردو شاعر کی رسائی ہو سکتی ہے۔ لیکن میری ذاتی رائے ہے جس میں شامل ہونے کی میں کسی کو دعوت نہیں دیتا، کہ غالب کی بلند پائیگی کا تمام تر سرمایہ ان کی غزلیں ہیں اور وہ غزلیں جو غالب کے بقیہ اُردو کلام سے قبل کی تھیں اور جن کو اب شائع کیا گیا ہے میرا خیال ہے کہ اُردو نوازی کے اس سے بہتر طریقے بھی ممکنات سے تھے۔ بہرحال

یہ محض ایک جملۂ معترضہ تھا، غالب ایسے جید شاعر کے کلام میں سب کچھ ہے جس کا تذکرہ مرحوم ڈاکٹر بجنوری نے کیا ہے لیکن کوئی مخصوص پیغام (MESSAGE) نہیں ملتا حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جو ساز اختیار کیا تھا وہ اس صنفِ کلام کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اور یہی نہیں بلکہ ایسا کرنے سے سارا ساز بے آہنگ ہو جاتا۔ اس میں شک نہیں مثنوی کے بعد شاعر کے زورِ قلم کا پتہ صرف غزل میں چلتا ہے۔ غزل ایک ایسا مختلف النوع خوان ہے جس پر ہر قسم کی نعمتیں چنی ہوتی ہیں۔ یہ بجے صرف سوز و ساز کے لئے مخصوص ہوتی ہے لیکن اگر تصوف کا رنگ حذف کر دیا جائے تو پھر سوز و ساز ہی صرف ایسی چیزیں نہیں ہیں جن پر قوم کی فلاح اور نجات کا مدار ہو۔ غالب کی شاعری ایک حد تک صرف ہائے و ہو اور نائے و نوش کی ترجمان ہے۔ اس میں شک نہیں غالب کا مشہور قطعہ؎

"اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار گر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے"

اردو میں عدیم المثال ہونے کے علاوہ خیام کی عبرت نوائیوں کے ہم پلّہ ہے لیکن ایسی خال خال مثالوں سے کوئی کلیہ استنباط نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری حقیقت جس کا اظہار کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں یہ ہے کہ غالب کی شاعری ان کے زمانہ کا آئینہ نہیں ہے۔ زبان کی صفائی اور پاکیزگی سے قطع نظر کرکے، ان کا پورا کلام آج سے صدیوں پہلے اور صدیوں بعد تک پیش کیا جا سکتا تھا اور کیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جذباتِ انسانی کی صحیح اور سچی ترجمانی کرتے تھے۔ وہ لسان القلب تھے لیکن لسان العصر ہونا ایک دوسری ہستی کے لئے قسمت ہو چکا تھا۔

حالی

حضرات! غالب کے متعلق میں نے جو اظہارِ خیال کیا ہے اس کی وضاحت حالی، اکبر، اور اقبال کی مثالوں سے کرنا چاہتا ہوں۔ حالی کے پورے کلام کا آپ سطحی نظر سے بھی مطالعہ کر جائیں تو آپ کو معلوم ہوگا، ایک خاص رنگ (مرثیہ) ان کے کلام تمام میں جاری اور ساری ہے سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد زمانہ کا یہی اقتضا تھا کہ قوم میں حالی پیدا ہوتے۔ ہر سانحہ، یا حادثہ کا پہلا اثر انسانی قلب پر درد انگیز اور افسردہ کن پڑتا ہے۔ دنیا تاریک نظر آتی ہے، زار نالی کے سوا قلب کو تسکین دینے والی کوئی چیز نہیں ہوتی، زخم تازہ ہوتا ہے، گذری ہوئی حالتوں کی یاد جراحت کو اور زیادہ شگفتہ بناتی ہے، وہ زمانہ یاد آتا ہے جب حرماں نصیبی کو خواب و خیال میں بھی بار حاصل نہ تھا، یہی حالت غدر کے بعد مسلمانوں کی تھی وہ تمام چیزیں جو کبھی صرف ہمارے لئے تھیں اب صرف ہماری آرزوؤں کا مدفن بن جاتی ہیں ہمارا ذہن خود بخود، سمرقند، اصفہان اور دمشق کے فضا، جیحوں اور دجلہ کی روانی، یثرب و بطحا

وصفا و زبید و نہرواں کی کشش، بصرہ و طائف کے نارستان و خرماستان مرو اور شیراز کے چمن اور گلستان، نہرِ رکنی اور گلگشتِ مصلّٰی کا سماں، سمرقندی اور شیرازی دعوتیں، ترکمانی صولت، مغلی جلادت، کُردی عزم اور بدوی حمیّت، ہاشمی آداب، عبّاسی فضائل، نطقِ اعرابی، عدنانی فصاحت، ضربِ کراری، حربِ خالدی، سطوتِ حمزی، جلالتِ فاروقی، اخلاقِ احمدی، اخوتِ اسلامی، جولان گاہ تاتار و زنجبار کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اِن کی مایوس یادسے تلملا اٹھتا ہے تو کہتا ہے ؎

چھین لی سب تم نے یہاں شانِ عرب آنِ عجم
تو نے اے غارتگرِ اقوام و اکّال الامم

لیکن فوراً ردِّ عمل شروع ہوتا ہے، افسردگی اور یاس غالب آتی ہے تو یوں گویا ہوتا ہے ؎

بزم کو برہم ہوئے مدّت نہیں گزری بہت
اُٹھ رہا ہے گل سے شمعِ بزم کے اب تک دھواں

ایسی حالت میں لوگ پند و نصیحت کرتے ہیں، زار نالی سے باز رہنے اور سانحہ کو بھلا دینے کی صلاح دیتے ہیں تو وہ بے اختیار ہو کر کہنے لگتا ہے ؎

ہیں یہ باتیں بھول جانے کی مگر کیونکر کوئی
بھول جائے صبح ہوتے رات کا سارا سماں

اور آخر میں بد دعا پر اپنی تان توڑ دیتا ہے ؎

آگ سی رہتا ہے جیسے دُردِ دُردِ آتش پرست
حکمراں تیرے یہ نہیں تجھ سے بہنگے برگراں

کیا ایک مجروح قلب اور اُجڑے ہوئے دل کے واردات کی اس سے زیادہ صحیح تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔
ان چند مثالوں کو پیش کر کے میں یہ حقیقت واضح کرنا چاہتا ہوں کہ حالی نے اپنے زمانہ کی صحیح مصوری کی ہے اور ان معنوں میں ان کا شمار حقیقی شعرا میں ہو سکتا ہے اور چونکہ ان کی ہر تان ماضی پر ٹوٹتی ہے اس لئے حالی کو بجا طور پر ماضی کا شاعر کہنا چاہیئے۔

لسان العصر

حضرات! زمانہ سے بڑھ کر مندمل کرنے والی شے دوسری نہیں ہے، کوئی زخم ایسا نہیں ہے جو سال و سنین کے بار سے دب نہ جائے کوئی جراحت ایسی نہیں ہے جس کا بہترین اور موثر ترین مرہم مرورِ ایام نہ ہو۔ مراثی کا دور ختم ہوتا ہے، قلب پر صبر و سکون کا تسلط ہوتا ہے، زخم مندمل ہو چکا ہے لیکن داغ باقی ہیں، بازوؤں میں سکت نہیں لیکن اغیار کی دراز دستی

اقربا کی سادہ لوحی اور غلط روی، برادرانِ یوسف کی بے اعتنائی اور سرد مہری، مذہب و ملت کی کس مپرسی، حکومت کا استیلا ایسی چیزیں ہیں جن کا نہ تو ماتم کیا جاسکتا ہے اور نہ مقابلہ، قلب پر چوٹ لگتی ہے تو سینہ سے آہ اُٹھتی ہے لیکن زبان پرواہ کا رنگ اختیار کرلیتی ہے، زار نالی بے ہنگام، مدافعت اور مقابلہ بے سود نظر آتا ہے تو اُن کے درمیان کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اور ہجو، مذمت، تنقیص، تعریض، شطحیات، استہزائیات مطائبات، ہزلیات اور مضحکات کا دور آتا ہے، شاعر ہنسا ہنسا کر رولاتا ہے اور کھلا کھلا کر مارتا ہے، تلخ حقائق کو شربت کا گھونٹ بنا دیتا ہے، روتا ہے تو ایسی صورت بنا کر کہ لوگ ہنستے ہنستے رو پڑیں، ہنستا ہے تو اس انداز سے کہ لوگوں کے گریہ گلو گیر ہو جائے عریاں ہوتا ہے تو اس پیرایہ سے کہ سنجیدگی قربان ہونے لگتی ہے۔

لسان العصر کے متعلق اقبال کا فیصلہ سنیئے ؎

سر ذرہ طور معنیٰ کلیمے — بہ بتخانۂ دور حاضر خلیلے
گہے گریۂ او چو ابرِ بہارے — گہے خندۂ او چو تیغِ اصیلے

حجازی تمدن اور مشرقی معاشرت کو مغربی دست برد میں دیکھ کر لسان العصر (اکبر مرحوم) اپنا پیغام رسالت یوں پہونچاتے ہیں ؎

ہمارا مشرقی دل نزع میں ہے وقت آخر ہے — نہیں مغرب کو غم اس کی نظر میں مرگ کافر ہے
غرور اتنا نہ کر قوت پر اپنی لے بتِ ترسا — ہمارے ہوش غائب ہیں مگر اللہ حاضر ہے

بتوں کی بات سے دل مائلِ فریاد ہوتا ہے — مگر کہنا ہی پڑتا ہے "بجا ارشاد ہوتا ہے"
مرے صیاد کی تعلیم کی ہے دھوم گلشن میں — یہاں جو آج پھنستا ہے وہ کل صیاد ہوتا ہے

ہم کو نئی روش کے حلقے جکڑ رہے ہیں — باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں
ذاتی ترقیاں ہیں قومی ہے یا تنزل — گرہیں یہ کھل رہی ہیں یا پیچ پڑ رہے ہیں

موجودہ دورِ حکومت پر کیسی کیسی تلخ نوائیوں سے کام لیا گیا ہے اور حاکم و محکوم کے جیسے کچھ تعلقات ہیں ان پر کن مختلف نوعیتوں سے اظہار خیال کیا گیا ہے، روشن ہیں لیکن لسان العصر کے یہاں یہ نقوش کس طور پر نمایاں کیئے گئے ہیں ؎

اکبر سے میں نے پوچھا اے واعظِ طریقت — دنیائے دوں سے رکھوں میں کسقدر تعلق

اُس نے دیا بلاغت سے یہ جواب مجھ کو انگریز کو ہے ہٹو سے جس قدر تعلق

اس شرط پر ہم سے فلک سے صلح آخر ہو گئی قبریں مہیا وہ کرے تزئین اُن کی ہم کریں

آخری شعر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اقبال کی وہ نظم بھی ملحوظ رکھیے جو نام نہاد "جمعیت الاقوام" پر لکھی گئی ہے ؎

بر فتد تا روشِ رزم دریں بزمِ کہن دردمندانِ جہاں طرحِ نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

موجودہ دورِ تہذیب کا اِس سے زیادہ بدیع نقشہ کھینچا جا سکتا ہے؟

کعبہ سے جو بت نکلے بھی تو کیا، کعبہ ہی گیا جب دل سے نکل
افسوس کہ بُت بھی ہم سے چھٹے، قبضے سے خدا کا گھر بھی گیا

کیا گزری جو اک پردے کے عدو، رو رو کے پولس سے کہتے تھے
عزت بھی گئی، دولت بھی گئی، بی بی بھی گئی اور زر بھی گیا

مرزا غریب چپ ہیں اُن کی کتاب ردی "بُدّھو" اکڑ رہے ہیں "صاحب نے یہ کہا ہے"

جو پوچھا مجھ سے دورِ چرخ نے کیا تو مسلماں ہے میں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا رمز پنہاں ہے
کروں اقرار تو شاید یہ ڈیوٹی کرے مجھ سے اگر انکار کرتا ہوں تو خوفِ قہرِ یزداں ہے
بالآخر کہہ دیا میں نے کہ گو مُسلم تو ہے بندہ ولیکن مولوی ہرگز نہیں ہے خانساماں ہے

موجودہ زمانہ میں تعلیم نسواں اور پردہ کے متعلق جن عریانیات سے کام لیا گیا ہے اور جن تلخ یا شیریں واقعات سے بحث کی گئی ہے ظاہر ہے۔ لسان العصر کا آئینہ خانہ بھی ملاحظہ ہو۔

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے خدمت میں ہے وہ لیڈی اور ناچنے کو بڈھی
تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

کون کہتا ہے کہ تعلیم زناں خوب نہیں — ایک ہی بات فقط کہنا ہے یاں حکمت کو
دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم — قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

آج کل کی مروجہ تعلیم و تربیت کو یوں پیش کیا ہے۔

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے — جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

کالج سے جنھیں امیدیں ہیں مذہب کو بھلا کیا مانیں گے — مغرب کو تو پہچانا ہی نہیں قبلے کو وہ کیا پہچانیں گے

نزول وحی مغرب نوجوانوں پر ہوا اے اکبر — زبانیں کالجوں کی کھل گئیں اب آپ چپ رہیے

ماسٹر کی بحث اگر مانیں نتیجہ ہے یہی — اب ہیں اچھے جانور، پہلے برے انسان تھے

نہ تیر افگنی ہے نہ اب حکمرانی — نہ وہ وضع ملت نہ قرآن خوانی
نہ باہم ادب ہے نہ وہ مہربانی — یہی کہتی پھرتی ہے لڑکے کی نانی
ہر اک شاخ میں پاس یہ لے ہوا ہے — مرا لال کالج کا کاکا توا ہے

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے — ایک ہیں خفیہ پولس میں ایک پھانسی پا گئے

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے — جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

بحث طویل ہوتی جاتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ آپ کا عزیز وقت ابھی سے رائیگاں ہونے لگے لیکن مجبوری ہے ؎ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست ۔
چند اور اشعار بھی آپ کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں، آپ خود اندازہ فرما سکیں گے کہ موجودہ حالتوں کی ان میں کس صنعت کارانہ طریقہ سے مصوری کی گئی ہے۔

افعی سے کہا میں نے مجھے تو نے ڈسا کیوں — بولا کہ بلا لاٹھی کے تو بن میں بسا کیوں

شاگرد ڈارون تو خدا ہی نے کر دیا — اکبر مگر نہیں ہے مداری کے ہاتھ میں

کالج کے منقبتوں سے کل کہہ رہے تھے اکبر — بسکٹ سے باز آنا رہبانیت نہیں ہے

آپس میں علم و ادب کچھ بھی نہیں پر ایک اکھاڑہ قائم ہے — جب اس سے فلک کا دل بہلے ہم لوگ تماشا کیوں نہ کریں

خوب یہ بات کہی اس نے پکار اس کو — بدرعا سانپ کو کیا دیتے ہو مار اُس کو

حضرات! لسان العصر کے جو ملفوظات اس وقت آپ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں اُن سے آپ کو کافی اندازہ ہو سکا ہوگا۔ یہ ہماری موجودہ حالت کی کہاں تک ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ موقع نہیں ہے ورنہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ لسان العصر کے کلام کو آپ کے سامنے پیش کرتا۔ بات میں بات نکلتی آتی ہے اور مجھے یہ خیال ہے کہ کہیں آپ اس سارے طوفان کلام سے گھبرانے نہ لگیں کیونکہ

رات تھوڑی ہے اور سانگ بہت!

میں نے علیحدہ ایک کتاب میں طنزیات (ہجو) کی تاریخ سے بحث کی ہے اور اُس میں لسان العصر کے کلام پر مفصل بحث کی ہے۔ جہاں تک میری تحقیق اور تدقیق نے میری رفاقت کی ہے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ طنزیات یا مضحکات میں لسان العصر کا جو پایہ ہے وہ آج تک دنیا کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوا ہے میں نے دعوے اور دلیل سے قبل ہی نتیجہ آپ کے سامنے پیش کر دیا اس لیئے ممکن ہے آپ میرے خیال سے اتفاق کرنے میں تامل فرمائیں اس لیے قبل اس کے کہ میری اس بے محل جرأت پر آپ سنجیدگی کے ساتھ غور فرمانا شروع فرمائیں اور طنزیات کے سلسلہ میں آپ کا سنجیدہ ہو جانا میں اپنی آئندہ توقعات کے لئے نیک فال نہیں تصور کرتا، میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس مسئلہ کو کسی دوسری مبارک ساعت کے لیئے ملتوی فرمائیں۔ جو کچھ میں نے لسان العصر کے متعلق اب تک عرض کیا ہے اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ "اکبر طور بر حال" کے شاعر کہے جا سکتے ہیں۔

"شاعرِ فرد استم"

حضرات! اسی سلسلہ کی آخری کڑی بھی ملاحظہ ہو، شور و شیون ختم ہو چکا، طعن و تشنیع کا زمانہ بھی اتمام کو پہونچتا ہے، قوم اور ملک میں بیداری کے آثار شروع ہوتے ہیں، زمانہ ایک دوسری بساط بچھاتا ہے، نظروں میں وسعت اور قلوب میں گرمی پیدا ہوتی ہے مذہب اور ملت کے تودۂ خاکستر میں کچھ دبی ہوئی چنگاریوں کا پتہ چلتا ہے، "ایامِ گل" کے آثار بھی ہویدا ہیں، "اشارہ" بھی ہونے والا ہے صرف "جیب چاک" کرنا باقی رہ جاتا ہے، یہاں تک کہ فضائے شعر میں تموج پیدا ہوتا ہے اور تمام موجودات

من صدائے شاعرِ فرد استم

پر صدائے لبیک بلند کرنے کے لیئے بیدار ہو جاتی ہیں۔

حضرات! ماضی اور حال کی داستانوں کی ترجمانی ہو چکی ہے، ادبِ اُردو اب مستقبل کے شاعر کی لئے چشم براہ ہے۔ یہ پیغام بھی اُنھیں فضاؤں کو چیرتا ہوا ہمارے کانوں تک پہنچتا ہے جہاں سے گزشتہ قومیں اپنے پیغامات لے کر نازل ہوئی تھیں اور جو رفتہ رفتہ جذب عناصر ہو گئے۔ اور جو کسی نہ کسی نوعیت سے ہمارے اخلاقی تمدنی اور سیاسی تار و پود میں نمایاں ہیں۔ اُنیسویں صدی کا آخری دور جس میں بیسویں صدی کا بھی کچھ حصہ شامل کر لینا چاہیئے۔ ہندی مسلمانوں کے انتہائی پستی اور نکبت کا زمانہ رہا ہے، ہر وہ جمود جو کسی قوم پر اس کی تباہی کے بعد مستولی ہوتا ہے کئی حیثیتوں سے المناک ہوتا ہے، ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا شیرازہ بکھرنا اتنا روح فرسا نہ تھا اور نہ ہو سکتا ہے جتنا اس سانحہ کا فقدانِ احساس "متاعِ کارواں" کے جانے کا غم اتنا دل شکن نہیں ہوتا جتنا "احساسِ زیاں" کے جانے کا واقعہ جانگسل ہوتا ہے۔ ادبار نکبت، پستی اور انحطاط جب اپنے انتہائی تاریکیوں کو پہنچ جاتے ہیں اس وقت فطرت اپنے ان کرشموں کو دفعتًا برافگندہ نقاب کرتی ہے جو انسانی توقعات سے بہت بلند ہوتے ہیں۔ اس نظریہ کی وضاحت کے لیئے تاریخ کا بے پایاں ذخیرہ موجود ہے، ہر برگزیدہ ہستی کی تاریخ پر نظر ڈالیئے آپ پر یہ حقیقت روشن ہو جائیگی کہ اس کا زمانہ رسالت ہمیشہ اُن حدود سے شروع ہوتا ہے جو کسی قوم اور ملک کی پستیوں کا آخری نشانِ منزل تھا، انبیائے مرسلین ہمیشہ ایسے ہی زمانہ میں مبعوث برسالت ہوئی ہیں، بڑے بڑے شعرا جن کے نغموں سے ذرّہ ذرہ مرتعش ہو گیا ہے انہی حالتوں میں منصّۂ وجود پر جلوہ گر ہوئے۔ حافظ اور گوئٹے کے دورِ حیات پر نظر ڈالیئے ایک تاتاری سیلاب کی موجوں سے ہم آغوش ہوا دوسرا انقلابِ فرانس کی ہیبت زائیوں سے دوچار۔

اقبال کا پورا سرمایۂ شاعری اُس نیابتِ الٰہی کا ترجمان ہے جس کا تذکرہ آج ہی صاحبزادہ صاحب کے عالمانہ خطبۂ صدارت میں آپ سُن چکے ہیں۔

نائبِ حق در جہاں بودن خوش ست | بر عناصر حکمراں بودن خوش ست
نائبِ حق ہمچو جانِ عالم ست | ہستیِ او ظلِّ اسمِ اعظم ست
خیمہ چوں در وسعتِ عالم زند | ایں بساطِ کہنہ را برہم زند
مدّعائے علّم الاسماستے | سرِّ سبحان الذی اسراستے
ذاتِ او توجیہ ذاتِ عالم ست | از جلالِ او نجاتِ عالم ست

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد | عالمے از ذرّہ تعمیر کرد

کوہ و صحرا دشت و دریا بحر و بر
تختۂ تعلیمِ اربابِ نظر

نائبِ حق در جہاں آدم شود
بر عناصر حکمِ او محکم شود

تابش از خورشیدِ عالمتاب گیر
برقِ طاق افروز از سیلاب گیر

چشمِ خود بکشاو در اشیا نگر
نشّۂ زیرِ برنِ صہبا نگر

تو کہ مقصودِ خطابِ انظری
پس چرا ایں راہ چوں کوراں بری

آں کہ بر اشیا کمند انداخت ست
مرکب از برق و حرارت ساخت ست

علمِ اسما اعتبارِ آدم ست
حکمتِ اشیا حصارِ آدم ست

اس نائبِ الٰہی کی پذیرائی کن الفاظ میں کی جاتی ہے۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو
در سوادِ دیدہا آباد شو

شورشِ اقوام را خاموش کن
نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن

نوعِ انساں مزرع و تو حاصلے
کاروانِ زندگی را منزلے

اغیار کی غلبہ زائیوں کے متعلق اقبال کا پیغام ہیجان کیا ہے۔

فارغ از اندیشۂ اغیار شو
قوّتِ خوابیدہ بیدار شو

سنگ چوں بر خود گمانِ شیشہ کرد
شیشہ گردید و شکستن پیشہ کرد

راست می گویم عدو ہم یارِ تست
ہستیِ او رونقِ بازارِ تست

گر فنا خواہی ز خود آزاد شو
گر بقا خواہی بہ خود آباد شو

اسی خیال کا اعادہ اقبال نے پیامِ مشرق میں یوں کیا ہے:۔

رفیقش گفت اے یارِ خردمند
اگر خواہی حیات اندر خطر زی

دمادم خویشتن را بر فساں زن
ز تیغِ پاک گوہر تیز تر زی

خطر تاب و تواں را امتحان ست
عیارِ ممکناتِ جسم و جان ست

ہندی مسلمانوں کے لیئے وطن پرستی اور قومیت کا مسئلہ نہایت معرکۃ الآرا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اُن لوگوں کو سخت لغزش ہوئی ہے جنھوں نے "ہندوستانی" ہونے کو "مسلمان ہونے" پر ترجیح دی ہے۔ اقبال کا رنگ بھی ملاحظہ ہو۔

عقدۂ قومیت مسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود

حکمتش یک ملت گیتی نورد
بر اساس کلمہ تعمیر کرد

تا ز بخششہائے آں سلطان دیں
مسجد ما شد ہمہ روئے زمیں

ہر کہ از قید حیات آزاد شد
چوں ملک در شش جہت آباد شد

مسلم استی دل بہ اقلیمے مبند
گم مشو اندر جہان چون و چند

می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم
در دل او یاوہ گردد شام و روم

آج اسلام جن ہلاکت زائیوں سے گزر رہا ہے اُس کو کچھ وہی لوگ محسوس کرتے ہیں جو ایک اسلام کو اپنی حیات کا تار و پود سمجھتے رہے ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اب اسلام اور مسلمان دونوں حیات کی آخری ساعتوں سے ہم آویز ہیں، لیکن ایک ہندی نژاد شاعر جس کی فضائے تخیل اسلام کی تابناکیوں سے لبریز ہے جس کی چشم تصور اسلام کی زندہ تاریخ سے بیدار اور جس کا قلب ان صداقتوں سے آشنا ہو چکا ہے جس کا مظہر عین اسلام اور صرف اسلام ہے، اس طور پر رجز خوانی کرتا ہے۔

اُمت مُسلم ز آیات خداست
اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ ست

از اجل این قوم بے پرواستے
استوار از نحن نزلنا ستے

تا خدا ان یطفئوا فرمودہ است
از فسردن این چراغ آسودہ است

ما کہ توحید خدا را حجتیم
حافظ رمز کتاب و حکمتیم

آسماں با ما سر پیکار داشت
در بغل یک فتنۂ تاتار داشت

سطوت مُسلم بخاک و خوں تپید
دید بغداد آنچہ روما ہم ندید

تو مگر از چرخ کج رفتار پرس
زاں نوآئین کہن پندار پرس

آتش تاتاریاں گلزار کیست؟
شعلہ ہائے او گل دستار کیست؟

از تہ آتش بر اندازیم گل
نار ہر نمرود را سازیم گل

شعلہ ہائے انقلاب روزگار
چوں بباغ ما رسد گردد بہار

رومیاں را گرم بازاری نماند
آں جہانگیری جہانداری نماند

شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست
رونق خمخانۂ یوناں شکست

مصر ہم در امتحاں ناکام ماند
استخوان او تہ اہرام ماند

در جہاں بانگ اذاں بودست و ہست
ملت اسلامیاں بودست و ہست

عشق آئینِ حیاتِ عالم ست   امتزاجِ سالماتِ عالم ست
عشق از سوزِ دلِ ما زنده است   از شرارِ لا الٰہ تابنده است

گرچہ مثلِ غنچہ دلگیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

کشاکشِ حیات کے متعلق اقبال کی تعلیم کتنی حرارت انگیز ہے! تنازع للبقاسے عہدہ برآ ہونے کی تعلیم کس آتش نوائی سے کی گئی ہے!

سنگ شد ای ہمچو گل نازک بدن   تا شدی بنیادِ دیوارِ چمن
از گلِ خود آدمے تعمیر کن   آدمے را عالمے تعمیر کن
گر بنا سازی نہ دیوار و درے   خشت از خاک تو بندد دیگرے
در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات   لذّتِ تخلیق قانونِ حیات
خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو   شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
با جہانِ نامساعد ساختن   ہست در میداں سپر انداختن
مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار   با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں   می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را   می دہد ترکیبِ نو ذرّات را
گردشِ ایام را برہم زند   چرخِ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوتِ خود آشکار   روزگارِ نو کہ باشد سازگار
آزماید صاحبِ قلبِ سلیم   زورِ خود را از مہمّاتِ عظیم
عشق با دشوار ورزیدن خوش است   چوں خلیل از شعلہ گل چیدن خوش است
ممکناتِ قوتِ مردانِ کار   گردد از مشکل پسندی آشکار
اے ز آدابِ امانت بے خبر!   از دو عالم خویش را بہتر شمر!

حضرات! اقبال کے متعلق میں نے ضرورت سے زیادہ طوالت سے کام لیا ہے، ممکن ہے آپ مجھ پر یہ الزام عائد فرمائیں کہ میں نے مضمون زیرِ بحث سے ناروا طور پر انحراف کیا ہے لیکن لیتِ شب بخیر" اس طویل انحراف سے کچھ اور مقصود نہ تھا - میرا مدعا یہ تھا کہ اقبال نے جو رنگ اختیار کیا ہے وہ مسلمانوں کے مذہبی اور اخلاقی حالات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے کیسا ہی کچھ نہ تصور کیا جائے"

ان کا کلام خود زبان اُردو کے لیے ایک جدید پیغام ہے یہ زندہ شاعری کا بہترین نمونہ ہے، یہ وہ شاعری ہے جس کو ملحوظ رکھ کر کارلائل نے شعرا کو پیغمبروں کی صف میں لانے کی کوشش کی ہے اور جائز کوشش کی ہے اقبال کو ایک خالص اسلامی شاعر تصور کرنا چاہیئے۔ ان کا پیغام تعلیم اسلامی کی زندہ تفسیر ہے۔ اقبال نے شاعری کی ایک نئی جولانگاہ پیش کی ہے جس میں قدم رکھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ اور میں یہ عرض کرنے کی بھی جرأت کرتا ہوں کہ اکبر اور اقبال دونوں اپنے اپنے وادی کے امام ہیں۔ اقبال نے اکبر کے رنگ میں بھی طبع آزمائی کی کوشش کی ہے لیکن دونوں خدوخال میں جو بیّن فرق نظر آتا ہے وہ اصحاب ذوق و بصیرت پر مخفی نہیں ہے۔ بہرحال یہ بحث یہاں پر بے موقع ہوگی۔ میں ابھی یہ عرض کر چکا ہوں کہ اقبال نے اُردو شاعری میں ایک جدید بنیاد قایم کی ہے اور اب ادب اُردو کا سنجیدہ طبقہ اسی طرف مائل ہے، اقبال جو منزلیں طے کر چکے ہیں، اب تک وہاں کسی کی رسائی نہیں ہوئی ہے لیکن اس میں شک نہیں اُردو شاعری کا رخ اب بالکل بدل چکا ہے۔ ابھی ہندوستان میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو زبان اور فن شاعری کے اعتبار سے اقبال کو وہ درجہ نہیں دیتے ہیں جس کو خود اقبال نہیں تو اُن کے پرجوش حامی اُن کے لیئے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ اقبال اب اُن حدود سے گزر چکے ہیں جہاں پہونچ کر مخالفین اُن کے دامن کو ہاتھ لگا سکتے تھے۔ اقبال ناظم نہ سہی ان کا شاعر ہونا تو مسلمات میں سے ہے!

حضرات! آج کل کے جدید دور شاعری کا آپ نے مطالعہ کیا ہوگا، آپ خود اندازہ لگا سکے ہونگے کہ آج کل کی قومی اور نیچرل شاعری کس کی تقلید کر رہی ہے اور رنگ و بو کے لیئے کس گلستان کی متلاشی ہے۔ غزل سرائی اور قصیدہ گوئی کا زمانہ اب گزر چکا ہے۔ اس میں شک نہیں ان کو پھر بیداری نصیب ہوگی لیکن یہ اُسوقت ہوگا جب ایک دوسرے اقبال کی ضرورت زمانہ کو محسوس ہونے لگیگی حقیقت یہ ہے ایک طور پر غزل، قصائد اور مثنوی (رزمیہ) کا وجود بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ ہر صنف کلام کی ابتداء اور عروج کا زمانہ ہوتا ہے اور ہر کلام میں زمانہ کے میلانات اور افکار کے نقوش کم و بیش نمایاں ہوتے ہیں، غزل کی زمین اس کے لیئے سب سے زیادہ ناموزوں ہوتی ہے لیکن یہاں بھی اقبال کا رنگ غالب ہے، اقبال کے لب و لہجہ کا اندازہ کرتے ہوئے مشکل کوئی شخص اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ وہ غزل کے رنگ میں بھی کامیاب ہو سکتے تھے۔ میں خود اس خیال کا مؤید تھا لیکن پیام مشرق کے شائع ہو جانے کے بعد ان خیالات کی بالکل تردید ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ لالۂ طور کے تحت میں اُنھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ محض اسرار اور رموز کی تفسیر ہے اور جو لوگ اسرار خودی اور رموز بیخودی سے مسحور ہو چکے ہیں اُن کے نزدیک لالۂ طور کی اہمیت کچھ زیادہ وقیع نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ اجازت دیں تو میں عرض کرونگا

کہ فی الحقیقت اقبال نے اپنا پیغام اسرار اور رموز سے پہلے شمع و شاعر ہی میں پیش کر دیا تھا۔ فرق صرف ناموں کا ہے۔ شاعری اور فلسفہ یا دل اور دماغ میں جو فرق ہے وہی امتیاز شمع اور شاعر اور اسرار اور رموز میں ہے۔ پیام مشرق میں جو حصہ سب سے زیادہ حرارت انگیز ہے وہ افکار اور مے باقی ہیں۔ افکار کے متعلق کچھ عرض کرنا بے سود ہوگا۔ یہاں اقبال اپنی پوری شاعرانہ بیداریوں کے ساتھ نمایاں ہیں بالخصوص میلاد آدم اور انکار ابلیس وہ الماس ریزے ہیں جن کا جواب دنیائے شاعری میں اگر کہیں مل سکتا ہے تو صرف ڈانٹے اور ملٹن کی سحر کاریوں میں میسر آسکتا ہے۔ آپ ہی انصاف فرمائیں۔

خبرے رفت زگردوں بہ شبستان ازل	حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد

(یا)

من زتنک مایگاں گدیہ نہ کردم سجود	قاہر بے دوزخم داور بے محشرم

یا مئے باقی کے اس ہیجان آور پیغام:

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے	یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ!

کا کیا جواب ہے!

حضرات! میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ پیام مشرق میں مئے باقی کے تحت میں اقبال کا جو کلام (غزل) شائع ہوا ہے وہ کئی صورتوں سے قابل توجہ ہے اول تو یہ کہ اقبال کے کمال شاعری میں یہ ایک مزید انکشاف ہے، دوسرے یہ کہ اقبال نے غزل میں بھی وہی آب و رنگ پیدا کر دیا ہے جو ان کی دیگر معرکۃ الآرا نظموں میں نمایاں ہے، ملاحظہ ہو:

بہ نوریاں ز من پا بگل پیامے گوئے	حذر ز مشت غبارے کہ خویشتن نگرست
بہ کیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی ست	سفر بکعبہ نہ کردم کہ راہ بے خطرست
ز خاک خویش بہ تعمیر آدمی برخیز	کہ فرصت تو بقدر تبسم شررست

رمز حیات جوئی؟ جز در تپش نیابی	در قلزم آرمیدن ننگ ست آب جو را
شادم کہ عاشقاں را سوز دوام دادی	درماں نیافریدی آزار جستجو را

یا ز خلوت کدہ غنچہ بروں زن چو شمیم	با نسیم سحر آمیز و وزیدن آموز
اگرت خار گل تازہ رسی ساختہ اند	پاس ناموس چمن دار و خلیدن آموز

تا کجا در تہِ بالِ دگراں می باشی — در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز

خود غزل کو اقبال نے "پیغام" رسانی کا ذریعہ بنایا ہے، فرماتے ہیں:-

بہ ایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم
غزل سرایم و پیغام آشنا گویم

ان غزلوں کے مطالعہ کے بعد میرا ذہن فی الفور نظیری نیشاپوری کی طرف منتقل ہوتا ہے، نظیری کے مانند اقبال نے بھی غزلیات میں تسلسل مضامین کا التزام رکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال کی تمام غزلوں کا تیور یکساں ہے لیکن ممکن ہے اس سے آپ یہ نتیجہ نکالیں کہ اقبال کے ہاں تغزل کا رنگ ہی مفقود ہے، اگر میرا یہ اندیشہ صحیح ہے تو میں آپ کے سامنے اقبال کا وہ کلام پیش کرونگا جسے سن کر، مجھے امید ہے کہ آپ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی فرمائینگے؛

بخلوتے کہ سخن می شود حجاب آنجا — حدیثِ دل بزبانِ نگاہ میگویم

بہ رہِ تو ناتمامم، ز تغافلِ تو خامم — من و جانِ نیم سوزی، تو و چشمِ نیم بازے

فرقے نہ نہد عاشق در کعبہ و بت خانہ — ایں جلوتِ جانانہ، آں خلوتِ جانانہ
از بزمِ جہاں خوشتر، از حورِ جناں خوشتر — یک ہمدمِ فرزانہ و ز بادہ دو پیمانہ
ہر کس نگہے دارد، ہر کس سخنے دارد — در بزمِ تو مے خیزد افسانہ ز افسانہ

اے جانِ گرفتارم دیدی کہ محبت چیست؟ — در سینہ نیاسائی از دیدہ بروں آئی
عشق ست و ہزار افسوں حسن ست و ہزار آئین — نے من بہ شمار آیم نے تو بہ شمار آئی
ہم با خود و ہم با او ہجراں کہ وصال ست ایں؟ — اے عقل چہ میگوئی، اے عشق چہ فرمائی

حضرات! آپ خیال فرماتے ہونگے، اقبال کے متعلق یہ طوالت پذیری بے محل اور ناروا ہے لیکن آپ یقین فرمائیں اقبال کے کلام کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ دورِ حاضر میں یہی نغمہ جرس کاروان ثابت ہوگا، زمانہ کی فطرت اسی کی متقاضی ہے اور اس سے سرتابی کرنگا

قرینِ مصلحت نہیں ہے۔ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اُردو کا دامن ان گرانباریوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اور اس میں سنجیدہ مضامین نظم و نثر کی گنجایش نہیں ہے۔ میرے بعض کرم فرماؤں کو یہ خیال بھی ہوگا کہ ادب اُردو کے موضوع پر اقبال کے فارسی کلام کو معرض بحث میں لانا بے موقع اور غیر متعلق ہے، یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے لیکن میں نے اقبال کا فارسی کلام پیش کیا ہے، ان کے فارسی آپ رنگ پر کہیں زور نہیں دیا ہے یہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے کہ اقبال اپنے تمام شاعرانہ کمال کے ساتھ فارسی شعرا کے صف میں داخل ہو سکتے ہیں یا نہیں، اس بحث کو چھیڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے، یہی کیا کم ہے کہ اقبال کو شاعری کے وہ مدارج حاصل ہو چکے ہیں کہ ان کا ہندی یا فارسی ہونا اب ایک لاطائل بحث سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ آپ خود غور فرمائینگے تو معلوم ہو جائیگا کہ اب غزل اور قصیدہ گوئی دونوں انحطاط پذیر ہیں، اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ اب غزل اور قصائد میں وہ خوبیاں باقی نہیں رہیں جو اس سے قبل تھیں، میرے کہنے کا صرف یہ مقصد ہے کہ اب سنجیدہ طبائع اس ساز سے کچھ بے اعتنا ہو رہی ہیں۔ پنجاب خصوصیت کے ساتھ اقبال کا رنگ اختیار کرتا جاتا ہے۔ میری تمنا ہے کہ اس کی ابتدا لکھنؤ اور دلّی میں بھی ہو جائے۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ باوجود اس کے کہ دہلی اور لکھنؤ اہل زبان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور حق بجانب بھی ہیں لیکن زمانہ کی طرف سے بالکل مستغنی ہو گئے ہیں، اگر آپ آزردہ نہ ہوں اور مجھے اجازت دیں تو میں عرض کرونگا کہ اگر زمانہ کی یہی رفتار رہی اور شعرا اور اہل زبان کا یہی عالم رہا تو کچھ دور نہیں ہے کہ دلی کو اس صف سے علیحدہ ہونا پڑے دلّی کی اُردو اب بجائے ٹکسالی ہونے کے بازاری اور تجارتی ہوتی جاتی ہے۔ مولانا حسن نظامی، حکیم ناصر نذیر فراق، علّامہ راشد الخیری اور ایسے ہی دو چار اور بزرگ باقی ہیں جن کے دم سے اُردو کا چراغ اب تک ٹمٹما رہا ہے، میں نہیں کہہ سکتا یہ حضرات اپنے صحیح اور سچے جانشین بھی چھوڑ گئے یا نہیں، لکھنؤ پھر بھی غنیمت ہے، ابھی وہاں کی آب و ہوا شعر و شاعری اور زبان کے لیے مساعد ہے اس حیثیت سے میں اس وقت لکھنؤ کو دلّی پر ترجیح بھی دیتا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے وہ دن دور نہیں کچھ دنوں میں اُردو کا کوئی "اسکول" باقی نہ رہ جائیگا، اور یہی اخباری زبان جو اس وقت اس کے ساتھ ملک کے مختلف حصص سے پیدا ہو رہی ہے لے دے کر ادب اُردو کا سرمایہ رہ جائیگی۔

حضرات! اس سلسلہ میں مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں میری یہ صاف گوئی مجھے اور زیادہ پیچیدہ مراحل طے کرنے پر مجبور نہ کر دے اور اس طور پر کچھ اصحاب اس جلسہ سے اٹھیں تو اُن کے ذہن میں چند باتیں خلط بھی رہ جائیں کیونکہ دلّی اور لکھنؤ کے مسئلہ کو چھیڑنا اپنی شامت اور دوسروں کی بدمذاقی کو دعوت دینا ہے، میں بدمذاقی سے اتنا ہی ڈرتا ہوں جتنا آپ حضرات اس کانفرنس کو مدعو کرنے سے گھبراتے

ہیں۔ بہرحال اس مسئلہ کو فی الحال ملتوی رکھئے اور مجھے اب اجازت دیجئے کہ میں موضوع زیر بحث کے دیگر پہلوؤں کو بھی آپکے سامنے پیش کروں جن کو میں نے ابتدا میں اس خیال سے نہیں پیش کیا کہ شاید آپ اس کے پہلے ہی سے متوقع رہے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص جس کی قسمت میں یہ لکھا ہو کہ وہ ایک سمجھ دار اور ذہین مجمع کو اپنا مخاطب بنائے، اس سے بہت گھبراتا ہے کہ لوگ اس کا مافی الضمیر پہلے ہی سمجھ لیں، گو اس میں بھی شک نہیں کہ وہ اسی حقیقت کو محسوس کرکے پہلے ہی سے، اور وہ بھی اتفاقاً فنِ تقریر کے اس اصول کو ذہن نشین کرلیتا ہے اور دورانِ تقریر میں اس کی مزاولت بھی رکھتا ہے، جس کی رو سے بتایا گیا ہے کہ مجمع کو اپنے سے زیادہ قابل نہیں سمجھنا چاہیئے، میں نے اس اصول کو عبارتِ سلبیّہ کی صورت میں نشر کیا ہے لیکن اصل میں وہ ایجاب کے نہایت پرزور اور عریاں الفاظ اور مفہوم میں ادا کیا گیا ہے۔

رینائیسنس

حضرات! یہ حقیقت آپ پر روشن ہوگی کہ غدر کے بعد مسلمانوں کی حمایت میں جو شخص سب سے پہلے سینہ سپر ہوا وہ سرسید تھے۔ میں ان کی خدمات کے صرف اس پہلو کو آپکے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جو اردو سے متعلق ہے، سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ کالج، تہذیب الاخلاق، اور ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ سرسید، محسن الملک، ڈاکٹر نذیر احمد، علامہ شبلی، مولنا حالی، ایسے ایسے یگانۂ روزگار جو ایک جا اور ایک زمانہ میں بمشکل جمع اور پیدا ہوتے ہیں، علی گڑھ کو اپنے پورے جارحانہ اور مدافعانہ طاقتوں کا محاذ بناتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان بزرگانِ قوم کی زبان اور قلم ایک عالم سے برسرپیکار تھا، سرسید ڈاکٹر نذیر احمد اور محسن الملک کی تحریر اور تقریر، مولنا چراغ علی اور مولنا آزاد کی تصانیف علّامہ شبلی اور مولنا حالی کی نظمیں، غرض ایک سیلاب تھا جو ہر مخالفت و مقاومت کو خس و خاشاک کی طرح بہالے گیا۔ اور اردو کے لئے ایسی شاہراہیں کھول گیا جس پر ہم آج آنکھ بند کرکے آتے جاتے ہیں۔ یہ زمانہ جائز طور پر اردو کا نشاۃ الثانیہ کہا جاسکتا ہے اردو کی ترقی اور توسیع کا یہی عالم تھا کہ اس پر اغیار کی مشتبہ نظریں پڑنے لگیں اور سر انٹونی میکڈانل کے زمانہ میں ابنائے ملک نے اس پر سب سے پہلا وار کیا۔ لیکن محسن الملک کی آتش نوائیوں نے اسے کچھ عرصہ کے لیے فرو کردیا، یہ پہلا واقعہ تھا جب اردو حکومت کے نظروں میں کھٹکی اور یہ مسئلہ ہماری توجّہ کو جذب کرنے لگا۔

تلخ حقایق

حضرات! یہ ایک مختصر روئداد تھی غدر کے بعد اردو کے ابتدائی مدارج کی، وہ زمانہ گزر گیا، وہ سرفروشیاں نذر نسیاں ہوئیں، وہ ہم نہ رہے وہ دل۔ اب ذرا موجودہ دور کے تلخ حقایق سے بھی آشنا ہونے کے لئے تیار ہوجائیے۔ آپ تعجب فرمائینگے

کہ میں موجودہ حالات اور واقعات کو تلخ حقائق پر کیوں محمول کرتا ہوں۔ اس کے میرے پاس وجوہ ہیں۔ میں نہایت ادب سے التماس کرونگا کہ باوجود اس کے کہ اُردو کی توسیع اور ترویج کے لئے اتنی کوشش کی جارہی ہے، باوجود اس کے کہ کثیر التعداد اُردو اخبار اور رسائل نکل رہے ہیں، اعلیٰ حضرت فرمانروائے دکن نے عثمانیہ یونی ورسٹی قایم کردی ہے، مسلم یونی ورسٹی میں اُردو لازمی مضمون قرار دیدیا گیا ہے مختلف گراں پایہ انجمنیں قایم ہوچکی ہیں بایں ہمہ اُردو داں طبقہ میں مشکل پانچ فی صدی ایسے لوگ مل سکتے ہیں جو بے تکلف صحیح اور ستھری اُردو بول یا لکھ سکتے ہیں۔ مجھے توقع ہے آپ میرے اس خیال سے آزردہ نہ ہونگے۔ آپ خیال فرماتے ہونگے جب ہم مہد سے لحد تک اُردو ہی سے وابستہ رہتے ہیں اور جب اُردو کے نشر و تعمیم کے ایسے ذرائع اور وسائل موجود ہیں، پھر اُردو سے بے بہرہ رہنے کے کیا معنیٰ؟ حضرات میں پھر عرض کرونگا کہ یہ سب صحیح ہے لیکن میرا خیال بھی غلط نہیں ہے۔ مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہے اور میں جس حقیقت پر پہونچا ہوں وہ عرصہ کی غور و فکر، تلاش اور تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اس میں شک نہیں اس وقت مختلف اور متعدد رسائل، اخبارات، کتابیں شائع ہو رہی ہیں، درس گاہوں کی کمی نہیں ہے، انجمنیں کثیر التعداد ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ تو نہیں اخذ کیا جاسکتا کہ اُردو خاطر خواہ ترقی بھی کر رہی ہے۔ آپ نے کبھی اس حقیقت پر بھی غور فرمایا ہے کہ محض معدودے چند اخبارات، رسائل اور کتابوں کے علاوہ جتنی اور مطبوعات ہیں ان سب کی زندگی اور موت ساتھ ہی ساتھ شروع ہوتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہماری تمام کوششیں غلط راستہ پر ہیں۔ کثرت کے معنی نفع کے تو نہیں ہوسکتے۔ سب سے بڑی فرو گزاشت جو ہم سے سرزد ہوچکی ہے اور جس کی اب تک تلافی نہیں ہوسکی ہے یہ ہے کہ اس وقت تک "اُردو" کا کوئی اسکول قایم نہیں ہوسکا ہے۔ اس سے پہلے دہلی اور لکھنؤ دو ایسے مقامات تھے جہاں اُردو کی ٹکسال تھی، زبان کی خوبی یا خرابی کا معیار وہیں تلاش کیا جاتا تھا اور یہاں کے فیصلے ناطق ہوتے تھے اس زمانہ میں نہ کوئی خاص انجمن اس کے لئے قایم تھی، نہ اخبارات اور رسائل شائع ہوتے تھے، نہ کانفرنس ہوتی تھی اور نہ چندہ جمع ہوتا تھا، صرف چند نفوس قدسیہ ایسے تھے جن کی فضیلت کا سکہ معیار امتحان ہوتا تھا۔ اس وقت جس طور پر اُردو exploit کیجا رہی ہے (ناجائز فائدہ اُٹھایا جارہا ہے) اس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ میں یہ نہیں عرض کرتا کہ اُردو کی ایسی جکڑ بند کی جائے کہ اس میں نشر و تعمیم کی گنجایش ہی نہ رہ جائے اور اُردو داں طبقہ میں صرف چند ایسے نفوس ہوں جن کو اُردو سے عہدہ برآ ہونے کا منصب حاصل ہو، یہ اصول ناممکن، غیر مناسب اور بے محل ہوگا۔ مقصد صرف یہ ہے کہ ایک ایسی انجمن یا اکاڈمی قایم کی جائے جس کے فیصلے، جہاں تک زبان کی صحت اور سلاست کا تعلق ہے، ناطق تسلیم کیئے جائیں۔ اس کے اراکین مشہور، مقتدر اور مسلمہ

قابلیت کی اہل زبان ہوں۔ اب تک اُردو کا کوئی جامع لغت مدّون نہیں ہو سکا ہے، کوئی معقول گرامر بھی مرتب نہیں ہو سکی ہے گو اس سلسلہ میں ہمارے بزرگ محترم مولانا عبدالحق صاحب بی اے سکریٹری انجمن ترقی اُردو کی مساعی ہماری انتہائی شکرگزاریوں کی مستحق ہیں۔ ممدوح نے جس پایہ کی قواعد اُردو مرتب کی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے اور ایک اُردو لغت کی تدوین کرنے میں جس سرگرمی اور خلوص کا اظہار کیا ہے وہ ہر نوع اُمید افزا ہے خدا اُن کے عزائم میں برکت دے۔ اسی سلسلہ میں دارالمصنفین کی گراں بہا خدمات کا بھی تذکرہ کرنا لازمی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس وقت دو ہی رسالے ایسے شائع ہو رہے ہیں جو ایک بڑی حد تک میرے اس نصب العین کے مطابق ہیں جن کا میں ابھی ابھی تذکرہ کر چکا ہوں۔ یعنی معارف اور اُردو، خدا اُن کو نظرِ بد سے محفوظ رکھے اور اُن کو آپس کی حریفانہ چشمک کا آماج گاہ نہ بنائے۔

حضرات! اب میں اپنی تقریر کے اس حصّہ کی طرف مائل ہونے کی آپ سے درخواست کروں گا جو میرے نزدیک اس تمام داستان کی بنیاد ہے۔ میں یہ نہیں عرض کر سکتا کہ ہمارے یہاں ماہران اُردو کی کمی ہے، یا خود اُردو میں استعداد ترقی نہیں ہے۔ میں صرف یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ اُردو کی پرستش نہیں ہے، اگر آج فرمان روایانِ دکن اور بھوپال اُردو کی سرپرستی سے کنارہ کش ہو جائیں تو جتنی موقر انجمنیں آج موجود ہیں اور جتنی گراں قدر خدمات وہ بجا لا رہی ہیں ان سب کا شیرازہ بکھر جائے۔ بظاہر یہ حقیقت نہایت تلخ معلوم ہوتی ہے کہ کسی زبان کی فلاح و نجات کا مدار ایسی بنیادوں پر ہو لیکن آپ یقین فرمائیں اس کی ضرورت ہر زبان کو ہمیشہ رہی ہے۔ اردو کیوں نظر انداز کی جاتی ہے اور انگریزی کو لوگ کیوں سینوں سے لگائے رہتے ہیں، آپ یقین فرمائیں یہ فیشن یا مغالطہ کی بنا پر نہیں ہے۔ میں اس کا بالکل قائل نہیں ہوں۔ اس کا اقتصادی پہلو یہ ہے کہ اُردو کا کوئی معاوضہ نہیں ہے۔ اُردو لکھنے پڑھنے اور سیکھنے میں لوگ تامل کرتے ہیں اس لئے کہ آذوقۂ حیات میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا، آپ خیال فرمائیں گے بہت سے فرائض ایسے ہیں جن کی بجا آوری ہر معاوضہ سے بے نیاز ہے لیکن اس کے لئے لوگ سرفروشیاں کرنے پر تیار رہتے ہیں۔ مثلاً وطن پرستی، حمایتِ دین وغیرہ وغیرہ۔ یہ بالکل صحیح ہے صرف یہ مسئلہ زیر بحث کے تحت میں نہیں آتا۔ اُردو کا مسئلہ مذہبی مسئلہ نہیں ہے۔ بعض حضرات یہ بھی پیش کر سکتے ہیں کہ یہ قومی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن جیسا میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں اُردو کا کوئی معاوضہ نہیں ہے اور حصول معاش میں اس سے کوئی معتدبہ نفع نہیں ہوتا۔ اور یہی سبب ہے کہ لوگ خلوص، شوق یا ضرورت کی بنا پر اس کی طرف بالکل نہیں متوجہ ہوتے جب تک اُردو کی قدر و قیمت روپیوں میں تحویل نہ کی جا سکے۔ لوگوں کی توجہ اس طرف مشکل منعطف کرائی جا سکتی ہے۔ ہم تمام عمر انگریزی زبان سیکھنے میں صرف کر دیتے ہیں اور ٹکسالی انگریزی لکھنے پر

قادر نہیں ہوتے لیکن یہ دقّت ہمّت شکن نہیں معلوم ہوتی اس لیے کہ حصولِ معاش یا ملازمت میں یہ بوجوہ معلومہ معین ہوتی ہے۔ اُردو داں دونوں حالتوں میں محروم رہتا ہے یہاں نہ ڈگری کی پرسش ہے اور نہ ذاتی قابلیت کی کوئی قیمت! پھر آپ ہی بتلائیں! اُردو سیکھنے کی دردسری سے فائدہ؟ ہر قابلیت کے لیئے کوئی مخصوص معاوضہ ہے، معاوضہ کی نوعیت مختلف ہوتی ہے، ڈاکٹر، انجنیر، وکیل، تاجر، سپاہی، غرض کہ سب کے لیئے ہندوستان اور دیگر ممالک میں کم و بیش ایسی جگہیں مل سکتی ہیں جہاں وہ قابلیت کا معاوضہ حاصل کرسکتا ہے پھر آپ ہی فرمائیں اُردو میں تبحر حاصل کرکے کسی کو نفع کی کیا توقع ہوسکتی ہے۔ کتنے اسکول یا کالج ہیں جہاں ان کے لیئے جگہ نکل سکتی ہے، کتنے دفاتر یا محکمہ جات ہیں جو اُن کی پذیرائی کے لیئے آمادہ ہیں، کتنے اخبارات یا رسائل ہیں جہاں ان کی پرسش ہوسکتی ہے۔ آپ گھر بیٹھ کر تصنیف اور تالیف ہی کی ابتدا کیونکر کرسکتے ہیں جب اُن کے پڑھنے والے ہی معدوم ہیں اور آپ کی تصنیف یا تالیف کی طلب ہی نہیں ہے۔ رہا یہ کہ کسی فن پر کامل دسترس ہی رکھنا ایک معاوضہ ہے اس کے متعلق صرف یہ گزارش ہے کہ زندگی کی بعض ضرورتیں اتنی شدید اور ناگزیر ہوتی ہیں کہ انسان کو اس کلیہ سے منحرف ہونا ہی پڑتا ہے۔

چند دقتیں

حضرات، دوسری دقّت جس کا ہم کو سامنا ہے وہ ہماری تمدّن اور معاشرت سے متعلق ہے اور اس سلسلہ کی آخری کڑیاں (یا دشش بخیر) فضائے مغرب سے منسلک ہیں۔ اُس عالم گیر میلانِ ذہنی کا کیا علاج جس نے مشرقی معاشرت اور تمدّن کے مقابلہ میں سراب مغرب کو باصرہ فریب بنا رکھا ہے۔ زندگی کے کسی شعبہ کو آپ پیش نظر رکھ کر اندازہ فرمائیں، آپ محسوس کرینگے کہ ہمارے خیال و افکار پر مغرب اور مغربیت کا رنگ کس درجہ غالب ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ ایک عرصہ سے مسلمان اپنے مذہبی معتقدات اساسی کو فراموش کرچکے تھے اور اُن کے بجائے اُن میں باطل پرستی (وسیع معنوں میں) سرایت کرچکی تھی میں اس وقت ان تمام واقعات اور حقائق کو آپ کے سامنے پیش کرنا نہیں چاہتا جو اسلام اور اسلامیوں پر گزر گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک زندہ حکمراں قوم کے لیئے ہندوستان کی سرزمین سب سے زیادہ مہلک ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا آخری دورِ حکومت اور اگر آپ اجازت دیں تو اس میں مغلوں کا پورا عہد حکومت شامل کرلوں، جہاں تک نفسِ اسلام اور معاشرت اسلامی کا تعلق ہے، کچھ زیادہ خوش آیند نہ تھا ملک میں کچھ اس طور پر امن و تسلط قایم رہا اور بیرونی حملوں کا احتمال نا ضعیف ہوگیا تھا کہ مسلمانوں کا وہ مذہب جو ہر کربلا کے بعد زندہ ہوتا تھا اور جس کے جوہر کشاکش حیات میں نمایاں ہوتے تھے، عافیت اور سکون کا خوگر ہوگیا۔ مسلمانوں کا مذہب اُن مذاہب سے

بالکل مختلف ہے جن کا مدار صرف معتقدات پر ہو وہ کشاکشِ حیات سے مقابلہ کرنے کے لیئے پیدا ہوا ہے
نہ کہ سکونِ حیات سے بہرہ اندوز ہونے کے لیئے۔ وہ مذہب جو دنیا کی علایق اور پیچیدگیوں کو نظر انداز
کر کے محض حیات بعد الممات کو پیش نظر رکھتا ہو یا جس کا مدار صرف رسمیات عبادت گزاری پر ہو، دنیا
میں کامیاب نہیں رہ سکتا۔ شاہانِ مغلیہ کے دورِ حکومت کو آپ کئی حیثیتوں سے عہد زرّیں کہہ سکتے ہیں
جہاں تک ملک کے نظم و نسق یا امن و تسلط کا تعلق ہے آپ جس طرح چاہیں اس دور کی تعریف فرمالیں لیکن
اگر آپ اس حقیقت حال کا اسلامی نقطہ نگاہ سے مطالعہ فرمائینگے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ حالات اور واقعات
کچھ بہت زیادہ اُمید افزا نہ تھے اور اس کا بہترین ثبوت، محی الملت اورنگ زیب عالمگیر کا دور حکومت تھا
اورنگ زیب کی حکمرانی فی الحقیقت شریعت اسلامی کی ترجمان تھی، رہا یہ امر کہ یہ دور کامیاب بھی رہا
یا نہیں، ایک بڑی حد تک متنازعہ فیہ ہے۔ بہرحال اگر ہم مخالفین ہی کے دعوے کو تسلیم کرلیں تو اس سے
میرے نظریہ کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اورنگ زیب کی ناکامیابی ہی اس امر کی دلیل ہے کہ اس کے
پیشروؤں نے شریعت اسلامی کی علم برداری کماحقہ نہیں کی تھی اور درحقیقت عالمگیر کا طرز حکومت
اس غیر اسلامی طرز حکومت کا ردِ عمل تھا جس کے ذمہ دار اس کے پیشرو تھے اس کے بعد جو مراحل پیش آئے اس میں مسلمانوں
کو سخت سے سخت ہزیمتیں اٹھانی پڑیں اب بجائے اس کے کہ کافی غور و فکر کے بعد ایک صحیح راستہ
اختیار کیا جاتا، لوگوں نے یہ تصور کر لیا کہ واقعات جو رنگ اختیار کر رہے ہیں وہی صحیح ہے۔ ایشیا
کا صحیفۂ اخلاق پرزہ پرزہ ہو چکا تھا، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ یہ اپنی استعدادِ حیات ہی زائل کر چکا
تھا یا اس میں فی نفسہٖ کچھ ایسی کمزوریاں تھیں جو سیلابِ مغرب کی تاب نہیں لاسکتی تھیں بلکہ حقیقت یہ تھی
کہ خود ایشیا اپنا دیرینہ سبق بھلا چکا تھا اور اسی وجہ سے اپنی استعداد کا صحیح اندازہ نہ لگا سکا۔ لوگ
غلط راستہ پر چلے اور خسارہ میں رہے لیکن سمجھتے یہ رہے کہ اس خسارہ کا باعث اصلی ان کی اسلامی
وہ تعلیم تھی جس کے سمجھنے میں ان سے ابتدا ہی میں غلطی سرزد ہو چکی تھی۔

حضرات! طبائع کا یہ حال تھا کہ علم و فن کے ظاہری کمالات افق مغرب پر چمک اٹھے، ایشیا
ٹھوکر کھا چکا تھا اور بجائے اس کے کہ وہ خود اپنی قوتوں سے سنبھلتا یا گر کر ابھرتا، مغرب نے اسی
دے دیا اور وہ بھی اس طور پر کہ ایشیا اپنے اعضاء و جوارح کی استعداد ہی کو فراموش کر بیٹھا، اس
لیئے مغرب نے خیالات وضع کیئے، مطمح نظر قایم کیا، قلب و دماغ ایجاد کیئے اور کیا کیا نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہے
کہ ہم نے اپنی صلاح و فلاح کا خالق اکبر مغرب کو قرار دے دیا۔ اس کے جو نتائج ظاہر ہوئے
ہونے والے ہیں ان کا تذکرہ بے سود ہے۔ میں نے یہ تذکرہ محض اس خیال سے چھیڑا تھا کہ اس سے

اندازہ کر سکیں گے کہ ہمارے قلب و دماغ اس وقت کن تاثرات کے حامل ہیں۔

حضرات! میں نے جو روئداد اس وقت آپ کی خدمت میں پیش کی ہے وہ ایک حد تک مہمل اور غیر متعلق سی معلوم ہوتی ہے لیکن میں نے اس کا تذکرہ یوں ضروری سمجھا کہ اس سے آپ ہماری اس روحانی انجماد، اور مہلک غفلتوں کا اندازہ کر سکیں گے جو ہمارے موجودہ دورِ حیات پر محیط ہیں، میں عرض کر چکا ہوں کہ اُردو کی طرف سے لوگ بے اعتنا ہونے لگے ہیں، اِس کے متعلق چند وجوہ بھی پیش کیے گئے تھے۔ لیکن اس سلسلہ کی آخری بحث جو ابھی ابھی ختم ہوئی ہے آپ کی توجہ کی سب سے زیادہ مستحق ہے۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں نے وہ تمام اسباب پیش کر دیئے جو ہماری بے توجہی کے موجب ہیں۔ یہ واقعات اور حقائق ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اب آپ مسئلہ زیر بحث کو اس صورت میں پیش کرنے کی اجازت دیجئے۔ کیا ان حالات کے ماتحت اُردو کی خدمت ہم پر لازم آتی ہے؟ لیکن اس سوال پر اظہارِ خیال سے قبل میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم کو سب سے پہلے ان نوعیتوں کو متعین کر لینا چاہیئے جن کے ماتحت یہ مسئلہ بحث میں لایا جا سکتا ہے۔

تاریخی پہلو

حضرات! سب سے پہلے تو ہم کو اس کا تاریخی پہلو لینا چاہیئے۔ اُردو کا ہر طالبِ علم جانتا ہے کہ اس زبان کی بنیاد مسلمانوں کے ہاتھ سے پڑی ہے۔ اس میں شک نہیں اس زبان کو مسلمان فاتحین اپنے ساتھ نہیں لائے، اس میں بھی شک نہیں اس کی اصل وہ پراکرتیں تھیں جو مختلف زمانوں میں مختلف طور پر نوواردوں کی گفت و شنید سے ممزوج ہوتی رہیں اور بالآخر شاہ جہاں کے دور میں بحیثیت مجموعی اُردو کے نام سے موسوم ہوئیں۔ مسلمانوں نے نہ صرف اس زبان کی بنیاد رکھی بلکہ اس کی تمام تدریجی اور ارتقائی منازل میں انھیں کا ذہن و دماغ کارفرما رہا اس لیے اس کے تحفظ اور تعمیم کی ذمہ داری بھی انھیں کے شانوں پر رکھی جائے گی۔ اُردو کا موجودہ ادبی درجہ کیسا ہی کچھ ہو (جس کے متعلق میں اس سے قبل اظہارِ خیال کر چکا ہوں) اس میں شک نہیں وہ مسلمانوں کی تمدن و معاشرت ان کے ذہنی اور دماغی ترقی کی تنہا حامل ہے۔ لوگ اس حقیقت کو بہت کم سمجھ سکے ہیں کہ کسی قوم کی زبان اس کی قومی حیثیت کی علم بردار ہوتی ہے، کسی قوم کے اولیں آثارِ انحطاط کا مطالعہ کرنا ہو تو اس قوم کے لٹریچر پر نظر ڈالیئے آپ پر یہ حقیقت بہت جلد منکشف ہو جائیگی کہ قومی زوال کی ابتدا ہمیشہ زبان کے زوال سے ہوئی ہے، اور یہی نہیں بلکہ اس کے اثر سے تشخصاتِ ملّی تک فنا ہو گئے ہیں۔ میں بخوفِ طوالت اس وقت تاریخی مثالیں آپ کے سامنے نہیں پیش کرنا چاہتا۔ آپ کسی قوم اور ملک کو نظر میں رکھ کر اس کلیہ کا جائزہ لیجئے۔ آپ ہمیشہ اسی نتیجہ پر پہونچیں گے جس کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔

ادبی پہلو

حضرات! اس کا دوسرا پہلو ادبی ہے۔ اس کے متعلق مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا اس کا میں نے ابتدا ہی میں اشارہ کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہم میں بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جن کو عربی اور فارسی پر کامل عبور ہو! میں تو یہاں تک عرض کرونگا کہ آج کل ان لوگوں کی بھی تعداد خال خال نظر آئے گی جن کو ان زبانوں میں مذاق سلیم حاصل ہو۔ اس کی ایک وجہ تو وہی جس کا میں اعادہ کر چکا ہوں یعنی مغربیت کا غلبہ، دوسرے یہ کہ عربی اور فارسی کے بہت سے جواہر ریزے خود اردو میں منتقل ہو چکے ہیں اور اب ضرورت کے وقت لوگ فوراً اردو ہی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ عربی اور فارسی سے بے خبر رہنے کے باعث مسلمانوں پر جو زوال نازل ہونے والا تھا، اور جو ایک حد تک نازل بھی ہو چکا ہے اُس کا تدارک اور سدِّ باب اُردو نے کر دیا اس طور پر اُردو ایک حیثیت سے مسلمانوں کی قومی زبان ہو چکی ہے اور اسے وہ ادبی منزلت حاصل ہو چکی ہے جس کی ہم کو ضرورت تھی۔ اس کی تیسری حیثیت معاشری ہے۔ آج کل ہندوستان میں جہاں مسلمانوں کے کم و بیش سات کروڑ نفوس قدسی داد زیست دے رہے ہیں۔ اور جو بیس کروڑ دیگر مذاہب کے نام لیوا ہیں، اُردو کم و بیش ہر جگہ بولی نہیں تو سمجھی ضرور جاتی ہے اردو کے علاوہ کوئی دوسری زبان ایسی نہیں جو ہندوستان میں اس کثرت اور سہولت کے ساتھ بولی یا سمجھی جاتی ہو۔ یورپ میں سیکڑوں زبانیں رائج ہیں جن کے بولنے اور سمجھنے والے نسبتاً بہت کم تعداد میں پائے جائیں گے تاہم ان زبانوں کی حیثیت تسلیم کی جا چکی ہے۔ میں تو یہاں تک عرض کرونگا کہ جو حیثیت فرنچ کو یورپ میں حاصل ہے وہ اُردو کو ہندوستان میں نصیب ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ یورپ فرنچ کا گہوارہ ہے، ہندوستان صرف اُردو کی لحد تاریک!

حضرات! اُردو کی مختلف نوعیتیں آپ کے سامنے پیش کی جا چکیں آپ اس کی اہمیت سے بھی آشنا ہو چکے اب میں آپ کے سامنے چند ایسے واقعات پیش کرنا چاہتا ہوں جن کی بناء پر آپ کو اُردو کی حمایت میں حصّہ لینا چاہیئے۔ دشواریاں ضرور زیادہ ہیں لیکن دشواریاں اُسی وقت تک دشوار رہتی ہیں جب تک اُن سے عہدہ برآ ہونے کا عزم نہ کر لیا جائے، طلب صادق اور عزم محکم سے بسا اوقات تقدیریں بھی بدل جایا کرتی ہیں۔ آپ یقین فرمائیں کہ اسی قسم کی دقتیں عرفی کے سامنے تھیں جن کا اس نے ہمیشہ کے لیئے یہ کہہ کر خاتمہ کر دیا تھا ؎

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خوان چو محمل را گراں بینی

حضرات! اُردو ہماری گزشتہ عروجِ عظمت کی تنہا یادگار یا سوگوار ہے۔ یہ حقیقت کہ اس کا دامن

ہماری ذات کے ساتھ وابستہ ہی یا اُس کے تکوینِ وجود کے دوسرے ذمہ دار ہیں۔ اس واقعہ سے آشکار ہو جاتی ہے کہ ہم اس کے عالمِ وجود میں لانے کے ذمہ دار نہ بھی ہوں، اغیار اسی بنا پر اس کی بیخ کنی پر آمادہ ہیں۔ پھر یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ یہ ہماری یا ہم اس کے نہیں ہیں۔ اگر اس مسئلہ کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہو جائے گی کہ اُردو کے ساتھ اغیار کو جو مخالفت ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اُردو کو عربی اور فارسی سے وابستگی ہے، اس نے مسلمانوں کے آغوش میں آنکھ کھولی اور مسلمانوں نے اس کے تحفظ، نشر و تعمیم میں اپنے بہترین سرمایہ ذہنی اور دماغی سے دریغ نہیں کیا۔ اس حقیقت سے مجھے خود انکار نہیں ہے بلکہ میں اس پر فخر کرتا ہوں کہ وہ عربی اور فارسی الماس ریزوں کی آئینہ دار ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کا دامن دوسری زبانوں کے جواہر ریزوں کے لئے کبھی تنگ رہا ہے۔ جہاں تک اس کی وسیع دامانی اور سیر چشمی کا تعلق ہے، دنیا کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ میں نے بخوف طوالت اس کی ابتدائے تاریخ کہیں نہیں پیش کی ہے اور نہ اب اس کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ترکی، اسپینی، پرتگالی، انگریزی، عربی، فارسی، سنسکرت اور بھاشا وغیرہ سے کس طور پر ممزوج کی گئی ہے اور ان زبانوں کے الفاظ کس طور پر اور کس حد تک اس میں موجود ہیں۔

حضرات، اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی قومی زبان ام الالسنہ عربی ہے جس کا حاصل کرنا ان کا قومی شعار ہونا چاہیئے۔ لیکن مسلمانوں کی موجودہ نسل میں کم لوگ ایسے ملیں گے جو اسلامی تہذیب اور معاشرت کے اُن ادبی لطائف اور حکیمانہ معارف سے براہ راست آشنا ہو سکتے ہیں جن کی عربی اور فارسی ادبیات حامل ہیں۔ ہم میں کم لوگ ایسے مل سکتے ہیں جو فارسی یا عربی زبان پر کامل عبور رکھتے ہیں اور ان سے براہ راست صحیح طور پر کچھ بھی اخذ یا اقتباس کر سکتے ہیں اور بعض اوقات اسی بنا پر نہایت فاحش غلطیاں سرزد ہو چکی ہیں۔ ان علوم سے جس سے کچھ ہم ناآشنا ہیں اس کی کمی صرف اُردو سے پوری ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ تقریباً تمام مشہور اور ضروری عربی فارسی کتابیں اُردو کا جامہ اختیار کر چکی ہیں۔ اس میں شک نہیں اس سلسلہ میں ترقی کی بے حد گنجائش اور ضرورت ہے لیکن اگر ہم اس ضرورت کو ایمانداری کے ساتھ محسوس کرتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اپنی قوتِ عمل کو بر سرِ کار نہ لائیں۔

جگت بھاشا

حضرات، دوسرا امر جو میں اس سلسلہ میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں وہ اُردو کے لنگوا فرینکا (جگت بھاشا) ہونے کا ہے یہ ایک نہایت معرکۃ الآرا مسئلہ ہے جس پر مخالفین اور موافقین دونوں اپنی پوری قوت صرف کر رہے ہیں اور چونکہ یوماً فیوماً یہ نہایت اندیشہ ناک صورت اختیار کرتا جاتا ہے، میں محض اس خیال سے کہ آپ شاید ایک صحیح نقطۂ خیال پر آسانی

کے ساتھ پہنچ سکیں، اسے کسی قدر شرح وبسط کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

حضرات، جو مسئلہ اس وقت اس درجہ اہم اور وقیع نظر آرہا ہے، اُس کی ابتدا آج سے تقریباً ساٹھ سال بیشتر ہو چکی تھی۔ ۱۸۶۳ء میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ملکی زبان کے ذریعے سے قوم میں تعلیم کی اشاعت کی جائے۔ اسی سوسائٹی سے ۱۸۶۶ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن عالم وجود میں آئی جس نے دوسرے ہی سال وائسرائے کی خدمت میں چند معروضات پیش کیں جن کا ایک مختصر خاکہ میں آپ کے سامنے پیش کرونگا۔

۱۔ اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہوا کرے۔

۲۔ دیسی زبانوں میں انھیں مضمونوں کا سالانہ امتحان ہوا کرے جن میں کہ اب طلبۂ کلکتہ یونیورسٹی انگریزی میں امتحان دیتے ہیں۔

۳۔ یا تو ایک اُردو فیکلٹی کلکتہ یونیورسٹی میں قائم کی جائے یا شمالی مغربی اضلاع میں ایک جدا یونیورسٹی دیسی زبان کی قائم ہو۔

یہ تجویز گورنمنٹ نے ایک حد تک پسند کرلی تھی لیکن ۱۸۸۲ء میں جب دیسی زبان کی تعلیم کا مسئلہ پیش ہوا تو واقعات نے دوسرا پہلو اختیار کیا اور یہ تجویز بار آور ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ۱۹۱۷ء میں یہ مسئلہ پھر حکومت کے سامنے آیا، اس موقع پر ہز اکسلنسی وائسرائے نے اپنے خیالات کا جس طور پر اظہار فرمایا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ "اگرچہ مجھے ان اصحاب کے ساتھ دلی ہمدردی ہے جو دیسی زبانوں سے بے پروائی کئے جانے کے شاکی ہیں لیکن اب انگریزی کا درجہ دیسی زبانوں کو دیا جانا عملی پالٹکس سے باہر ہے۔ اس مسئلہ میں سب سے بڑی دقت مختلف دیسی زبانوں کا وجود ہے جس کا کوئی قابل اطمینان علاج اب تک نہیں پیش کیا گیا۔"

ہز اکسلنسی کے ان خیالات پر اگر آپ غور فرمائیں تو جہاں اور بہت سی باتیں معلوم ہونگی یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ ہندوستان میں ایک مشترک زبان کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے اور یہ ضرورت صرف آج نہیں پیدا ہوئی ہے بلکہ یہ مسئلہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد سے زیر بحث رہا ہے۔ اس سلسلہ میں میں آپ کے سامنے کمپنی مذکور کے ایک فاضل رکن مسٹر کریو کے خیالات پیش کرتا ہوں۔ وہو ہذا:

"اُردو کی اس وقت یہاں حالت بجنسہ فرنچ کی سی ہے کہ وہ تمام یورپ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس ایک اُردو کے جان لینے سے ایک حصۂ ملک سے دوسرے حصہ ملک تک بے تکلف آؤ جاؤ، کسی معاون اور ترجمان کی ضرورت نہ ہوگی۔ یہ اُردو، عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت کے میل سے بنی ہے اور

فارسی خط میں (بہ نسبت دیوناگری کے) اس کا لکھا جانا زیادہ آسان اور بامعنی ہوتا ہے"

حضرات، اُردو کی یہ حالت اس وقت تھی جب وہ آج سے بقدر سوا سو سال نو عمر تھی! یہ اُردو کے اسی استعداد اور ہمہ گیری کا تصرف تھا کہ آخر ۱۸۳۵ء میں یہ سرکاری دفاتر کی زبان قرار پائی، اس مدت دراز میں یہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی، ایک واقعہ ہے جس کی تفصیل کی مجھے ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اُردو نے قلعہ معلّیٰ سے ہجرت کر کے فورٹ ولیم میں پناہ لی تھی اور ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی نگرانی میں فورٹ ولیم میں اُردو کالج قائم ہوا تھا، سرکاری سرپرستی اور کلکتہ کی آب و ہوا دونوں راس آئیں اور تقریباً نصف صدی تک اُردو وہیں پھلتی پھولتی رہی۔ لیکن آخر کار یاد وطن غالب آئی اور ۱۸۴۰ء میں، ڈاکٹر اسپرنگر کی نگرانی میں دلی میں ایک اردو سوسائٹی قائم ہوئی جو غدر تک نہایت کامیابی کے ساتھ ترقی کے ابتدائی مراحل طے کرتی رہی اس کے بعد علی گڑھ اور سائنٹفک سوسائٹی کا دور آتا ہے جس کا ایک مجمل تذکرہ آپ اس سے قبل سن چکے ہیں۔

حضرات، اس مختصر سرگزشت کو پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں ابتدائے عہد انگریزی سے ہی ایک مشترک زبان کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ ابتدا ہی میں یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی تھی کہ ہندوستان میں اگر کسی زبان میں حکبت بہا شا ہونے کی صلاحیت تھی تو وہ اُردو تھی۔ جس حد تک اس بحث پر گفت گو ہو چکی ہے اور جن واقعات کا میں تذکرہ کر چکا ہوں کیا اس کے بنا پر یہ عرض نہیں کر سکتا کہ صرف اُردو ہی ہندوستان کی مشترک زبان بن سکتی ہے۔ اُردو اور ہندی کا جو لوگ سوال اُٹھاتے ہیں وہ حقیقتاً زبان کے فلسفہ سے ناآشنا ہیں۔ اُردو کی ساری داستان آپ کے سامنے بے نقاب ہو چکی ہے اس کے اجزاء ترکیبی پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوگا کہ اس میں ہندو مسلم اتحاد کے عناصر پورے طور پر ممزوج ہو چکے ہیں اور اب صرف جہالت اور تعصب کی بنا پر اس کی مخالفت کی جاتی ہے۔ ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا بہترین مظہر خود اُردو ہے!

نفس زبان

حضرات! "زبان تین چیزوں سے مرکب ہے، اسماء، افعال اور حروف۔ زبان کی اصل افعال اور حروف پر ہے۔ اسماء دوسری زبانوں سے منتقل ہوتے رہتے ہیں، مٹتے رہتے ہیں اور بدلتے جاتے ہیں، جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جائے گا اور وسائل آمد و رفت میں ترقی ہوتی جائیگی، اسماء کا ہر زبان میں اضافہ ہوتا رہے گا، خود عربی اس سے بری نہیں ہے سیکڑوں اسماء اور الفاظ دوسری زبانوں کے آکر مخلوط اور ممزوج ہو گئے ہیں، فارسی میں بے شمار الفاظ عربی کے آکر مل گئے ہیں۔ انگریزی میں بے شمار یونانی اور لاطینی الفاظ ہیں، بایں ہمہ آپ ان کو عربی، انگریزی یا

فارسی ہی کہتے رہتے ہیں۔ اسی طور پر اگر غریب اُردو میں عربی فارسی اسماء مل گئے ہیں تو اس سے اس کے ہندوستانی ہونے میں کیا قباحت لازم آتی ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اس کے تمام تر افعال تمام تر حروف اور نصف اسماء بھاشا یا ہندی ہیں۔ اس میں شک نہیں ہندو اور مسلمانوں کے قومی اور مذہبی ضروریات کے لحاظ سے جو کبھی نہیں مٹ سکتیں اس کا خزانہ عاریت با ختلاف قومیت عربی فارسی اور سنسکرت ہی رہیگا اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔ مصر کے مسلمانوں اور عیسائیوں کی زبان عربی ہے لیکن عیسائیوں کی تمام مخصوص قومی اور مذہبی اصطلاحات قبطی ہیں"۔ (مقتبس)

رسم الخط

حضرات! دوسرا اعتراض اُردو پر رسم الخط اور اس کی پیچیدگیوں کا ہوتا ہے۔ یہ اعتراض نہایت معرکۃ الآرا ہے اور میں اسے کسی قدر تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، اُردو اور اُردو کا رسم الخط دونوں ہندو مسلمانوں کا ایک پر خلوص تاریخی مفاہمہ ہے جس پر دونوں ایک عرصہ تک کاربند رہے، مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر عربی، فارسی اور ترکی کو پس پشت ڈالا اور اپنے ملکی بھائیوں کی زبان کو سر آنکھوں پر لے لیا اور اس طور پر انتہائے ایثار کا ثبوت دیا، ہندوؤں نے اس کا یہ معاوضہ دیا کہ انھوں نے اپنے نووارد مہمانوں کے وہ حروف اختیار کر لئے جو سامی عہد کے یادگار تھے۔ اس طرح پر گویا رشتۂ زنار میں تسبیح کے دانے پروئے گئے! بہرحال اگر اب یہ مفاہمہ نظر انداز کرنے کے قابل ہو گیا ہے اور یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اُردو رسم الخط فی نفسہ ناقص ہے تو آپ مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں کہ فی الحقیقت یہ "حروف نہ صرف مختصر نویسی کا ایک اعلیٰ نمونہ اور فن تحریر کے ارتقاء کی جامع اور مختصر تاریخ اور ریٹ مین کے معلم اور ہادی ہی تھے بلکہ تاریخ زبان اُردو کے وہ بے مثل مفسر اور شارح بھی تھے کہ بہ یک نظر اُن کل الفاظ کو مع ان کی پوری شکل و شمائل اور صحیح آواز و معنی اور جسیت و درست لب و لہجہ کے عیاں و ظاہر کر سکیں جن کے آمیزش سے یہ زبان صدیوں کی کد و کاوش کے بعد آج شرفا و نجبا کے منہ تک آنے کے قابل اور لائق بنی اور اپنے گزشتہ کارناموں کو آپ بتا رہی ہے"۔ رسم الخط کے متعلق آج کل ایک نہایت مفید بحث چھڑی ہوئی ہے اور رسالہ "اُردو" میں چند نہایت سنجیدہ اور جامع مضامین اس مبحث پر شائع ہو چکے ہیں لیکن جہاں تک میری رائے ہے یہ نقص اتنا سنگین نہیں ہے کہ اُردو من حیث الکل مورد لعن و طعن قرار دے دی جائے یا جس کی بنا پر بہی خواہان اُردو کو مایوس اور بددل ہونا چاہئیے، دنیا کا کوئی رسم الخط ایسا نہیں ہے جس میں دوسری زبانوں کے وہ الفاظ جو صحیح مخارج سے ادا کئے جائیں ظاہر ہو سکیں تلفظ کا اظہار کسی رسم الخط سے نہیں ہو سکتا اس کے لئے صرف سامعہ اور ناطقہ کی ضرورت ہے۔ انگریزی کے بعض الفاظ

کو لے لیجئے جہاں تک الفاظ میں حروف کی نشست و دروبست کا تعلق ہے کوئی شخص نہیں کہہ سکتا (بشرطیکہ اس نے ان کا صحیح تلفظ کہیں سُنا نہ ہو) کہ ان کا صحیح تلفظ کیا ہوگا، پھر اس کا کیا علاج کہ کسی زبان کے مخصوص لب و لہجہ کو دوسری زبان والا ٹھیک طور پر ادا بھی نہیں کرسکتا، اس بنا پر اس زبان کے رسم الخط پر حرف نہیں آتا۔ تلفظ کا مدار اس میں شک نہیں ایک بڑی حد تک رسم الخط اعراب اور حرکات پر ہوتا ہے لیکن یہ فرض کرلینا کہ اس کا مدار صرف اسی پر بالکل ناروا ہوگا، دنیا میں ایسی زبانیں بھی کبھی رائج رہی ہیں جن کے الفاظ اور حروف کچھ اور ہوتے تھے اور ان کا تلفظ کچھ اور ہوتا تھا، اس کی بہترین مثال 'پہلوی' ہے پھر دور کیوں جائیے انگریزی میں بھی ایسے الفاظ ملیں گے جن کے حروف اور اور ان کی دروبست سے ان کے تلفظ کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض اوقات یہ اعتراض بھی پیش کیا جاتا ہے کہ کہ اس رسم الخط کے سیکھنے میں نہایت دقت اور طوالت ہوتی ہے اس کے متعلق میں اکبر کے وقت کا طریقۂ تعلیم آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جس کا تذکرہ بابو نریندر و ناتھ نے "ترقی علوم" میں کیا ہے وہو ہذا:

"بچوں کو پہلے فارسی حروفِ تہجی سکھائے جاتے اس میں آٹھ دن سے زیادہ نہ لگتے، املا سکھانے اور پڑھانے میں دو تین آٹھ روز صرف ہوتے۔ پھر جملے اور اخلاقی فقرات بتلائے جاتے اور ایک ماہ کے اندر اندر (اس غیر زبان کو) لڑکا خود سب پڑھ لیتا"

حضرات! اس بیان میں بالکل مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں ہندی املا اس سے سہل ہے اور اس میں املا کی غلطیوں کا کم احتمال ہے، لیکن زود نگاری اور مختصر نویسی کی مثال صرف اُردو رسم الخط میں مل سکے گی۔ اب رہا یہ امر کہ عربی اور فارسی الفاظ کا املا نسبتاً مشکل ہے اور اس میں غلطیوں کی گنجائش ہے۔ اس کے متعلق مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ عربی اور فارسی کے وہ الفاظ جن کا املا مشکل ہوتا ہے بالعموم ایسے وقت استعمال میں لائے جاتے ہیں جب طالب علم، تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کرلیتا ہے اور اسے فارسی عربی میں کسی قدر دستگاہ حاصل ہوجاتی پھر ایسی حالت میں اُسے املا کی کوئی دقت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ معمولی نوشت خواند کا طالب علم ہر زبان کے املا میں غلطی کرتا ہے اور کرسکتا ہے۔ بہرحال اگر اُردو کا مقابلہ ہندی سے ہے تو اس امر کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ہندی خط سے زیادہ آسانی کے ساتھ اُردو خط پڑھا جاسکتا ہے اور اسی حقیقت کو مدنظر رکھ کر، اکبر نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا ہے:

بھائیو تم کبھی ہندی کے مخالف نہ بنو   بعد مرنے کے کھلے گا کہ یہ بھی کام کی بات
بسکہ تھا نامۂ اعمال مرا ہندی میں   کوئی پڑھ ہی نہ سکا مل گئی فی الفور نجات

حضرات ! اصل یہ ہے کہ جو لوگ یا جو قومیں ہندو مسلم اتحاد کو کسی خاص غرض کی بنا پر غیر مفید
سمجھتی ہیں وہی اُردو ہندی کے مناقشہ کو مہمیز کرتے رہتے ہیں۔ بہر حال اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے
کہ ان کے خلوص نیت پر حرف نہیں لایا جاسکتا تو میں عرض کرونگا کہ فی الحال آپ رسم الخط کے مسئلہ کو
مختلف حصص ہندوستان کے رواج پر کیوں نہ چھوڑ دیں، رفتہ رفتہ یہ اختلافات خود مٹ جائیں گے
ہم کو اس وقت اکبر مرحوم کے اس خیال کو ذہن میں رکھ کر عبرت حاصل کرنی چاہیئے ؎

ہم اُردو کو عربی کیوں نہ کریں، اُردو کو وہ بھاشا کیوں نہ کریں
جھگڑے کے لئے اخباروں میں مضمون تراشا کیوں نہ کریں

آپس میں عداوت کچھ بھی نہیں پر ایک اکھاڑا قائم ہے
جب اس سے فلک کا دل بہلے ہم لوگ تماشا کیوں نہ کریں

فارسی عربی

حضرات ! اُردو پر سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اس میں
فارسی اور عربی کے الفاظ اس کثرت سے آتے ہیں کہ ان کا سمجھنا یا یاد رکھنا
سیکھنا دشوار ہوتا ہے۔ اس اعتراض پر کچھ اور عرض کرنے سے قبل میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ
وہ کونسی زبان ہے جس کا سمجھنا، لکھنا پڑھنا یا سیکھنا دشوار نہیں ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسے ادبی
حیثیت بھی حاصل ہے۔ انگریزی سے زیادہ غیر مانوس زبان تو ایک ہندوستانی کے لئے بمشکل کوئی اور
ہو سکتی ہے لیکن ابتداءً اگر آپ کو مدراس یا کلکتہ نواح فورٹ ولیم میں بہت سے ایسے جاہل محض مل سکتے
تھے اور اب بھی مل سکتے ہیں جو دیگر زبانوں سے نا آشنائے محض تھے لیکن اپنا مافی الضمیر آسانی کے ساتھ
انگریزی میں ادا کرسکتے تھے۔ بہت سے ہندوستانی سپاہی جو جنگ یورپ میں شریک تھے، ایسے ملیں گے
جو باوجود اس کے کہ نہایت قلیل عرصہ تک یورپ کی سرزمین پر رہے، ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول لیتے ہیں
پھر کیا وجہ ہے کہ ایک ہندوستانی جس کی خمیر میں ہندوستان کی آب و گل موجود ہے اور جس کے ہوش و
حواس اور ذہن و دماغ یہاں کی لب و لہجہ سے آشنا ہیں اُردو نہ سیکھ سکے یا اس میں نہایت آسانی
کے ساتھ گفتگو نہ کرسکے۔ جہالت، تعصب اور تنگ نظری کو خیرباد کہدیا جائے تو ہمارے ابنائے وطن
اس حقیقت کو فراموش نہیں کرسکتے کہ اُردو ہی ایسی زبان ہے جو نہایت آسانی کے ساتھ مقبول انام
بنائی جاسکتی ہے۔ اگر کسی خاص امر کی بنا پر وہ کوئی دوسری زبان اختیار کرنا چاہتے ہیں تو ان کو کم
از کم یہی محسوس کر لینا چاہیئے کہ اُردو اس سلسلہ میں دوسری زبانوں سے زیادہ قطع مسافت کرچکی
ہے۔ وہ ہندوستانی زبان جس کا خاکہ ہندوستان کے سب سے بڑے مقتدر فرد نے پیش کیا ہے وہ

کسی حیثیت سے علمی یا ادبی زبان نہیں بن سکتی۔ اگر اس کا جواب یہ ہو کہ اسے علمی یا ادبی ہونے کی ضرورت ہی کیا ہی تو میں عرض کروں گا کہ آخر اس میں کیا قباحت ہی اگر ہم ایک ایسی زبان کو ترقی دیں جس میں دونوں حیثیتی صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں، آخر ہندوستانی کا مفہوم کیا ہی۔ شاید اس کے یہی معنی ہوں کہ اس زبان کے تمام الفاظ ایسے ہوں جو کسی بیرونی زبان سے مستعار نہ لئے گئے ہوں یا ان میں دیگر زبانوں کے الفاظ کی آمیزش نہ ہو، میں نہیں سمجھ سکتا، دنیا میں کوئی زندہ زبان بیسویں صدی میں ایسی بھی دریافت کی جا سکتی ہی جس میں دوسری زبانوں کے الفاظ کم و بیش نہ پائے جاتے ہوں۔ ہندوستانی زبان کا عملی مفہوم میرے نزدیک یہ ہی جسے عام لوگ آسانی کے ساتھ سمجھ لیں یا جس میں سہولت کے ساتھ اظہار خیال کر سکیں۔ اگر یہ مفہوم صحیح ہی تو میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کیا اُردو بہمہ وجوہ ان صفات سے متصف نہیں ہی۔ حقیقت یہ ہی کہ کوئی زبان خواہ وہ کیسی ہی صاف سلیس اور شستہ کیوں نہ ہو، ادنیٰ طبقہ کے لب و لہجہ میں جب ادا کی جائیگی اس کی مخصوص لطافتیں بالکل مفقود ہو جائیں گی۔ وہ "ہندوستانی" جس کا خاکہ ~~مہاتما~~ گاندھی نے پیش کیا ہی ہمارے سامنے ہی۔ میرا خیال ہی پنڈت مالوی بھی اسی کی علم برداری کا دم بھرتے ہیں۔ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کیا وہ زبان جسے پنڈت موصوف بولتے ہیں ایک دہقانی یا ادنیٰ طبقہ کے زبان پر آنے کے بعد اپنی مخصوص لطافتیں (اگر کوئی ہوں) قائم رکھ سکتی ہی؟ پھر جب اصل ہی بے حقیقت اور رکیک ہو تو اس کا ان لوگوں کے ہاتھوں کیا حشر ہوگا، کم سے کم میرے حیطۂ تخیل میں تو بالکل نہیں آسکتا۔ اس سلسلہ میں میں انگریزی کی مثال بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ باوجود اس کے کہ یہ ایک مکمل اور مبسوط زبان تسلیم کی گئی ہی لیکن آپ نے کبھی اسے کسی گورے سپاہی کی زبان سے بھی سُنا ہی۔ ایسی حالت میں اگر آپ شکسپیر، ملٹن، گولڈ اسمتھ یا ٹینسن یا خود انگریزی زبان کو مورد لعن و طعن بنائیں تو کہاں تک حق بجانب ہونگی۔ اسی طور پر اگر کوئی نرا دیہاتی شستہ اُردو بول یا سمجھ نہیں سکتا تو عربی اور فارسی کیوں مورد عتاب ہو۔ اس سے بھی قطع نظر کیجئے، پوربی زبان کا شمالی ہند کی دیگر زبانوں سے مقابلہ کیجئے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ خود بھاشا جو اُردو کا ماخذ بتائی جاتی ہی اور جو پورب کی زبان ہے، ہر اعتبار سے قریب تر ہی، عوام کی سمجھ سے بلند ہی۔ میرا تعلق خود پورب سے ہی اس لئے ممکن ہی آپ میرے اس نظریہ سے اتفاق نہ کریں، میں خود جب تک پورب میں رہا اکثر یہ خیال کرتا رہا کہ پورب کی زبان کچھ زیادہ قابل رشک نہیں ہی لیکن اب جب کہ مجھے پچھم کے اضلاع میں رہنے کا اتفاق ہوا اور یہاں کے عوام کے لب و لہجہ سے آشنا ہوا مجھے یقین ہو گیا کہ پورب کی زبان کئی اعتبار سے قابل ترجیح ہی۔ الفاظ کے ذخیرہ سے مجھے بحث نہیں ہی، اس میں پورب کو ہر نوع تفوق حاصل ہی، جہاں تک کسی زبان کے سہل و رواں ہونے کا تعلق ہی، مشرق کو مغرب پر ترجیح حاصل ہی۔ آپ معاف فرمائیں اس

اظہار خیال سے میری نیت کسی پر حملہ کرنے کی نہیں ہی مقصد صرف یہ تھا کہ جس زبان کو ہندوستانی کہا جاتا ہی وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہی جو زبان کے مسئلہ پر آخری لفظ ہو!

تقلید!!

حضرات! اُردو کے متعلق جو اعتراضات ہیں وہ کم وبیش آپ کے سامنے پیش کردیئے گئے۔ میری فہم واستعداد اور آپ کے صبر و تحمل نے جہاں تک مساعدت کی، ان کے جوابات بھی عرض کردیئے گئے۔ مجھے ایک امر کے متعلق اور عرض کرنا ہی اور وہ یہ کہ جو لوگ اُردو پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ وہ مشکل اور دقیق ہی وہ اُردو کی مختلف اقسام کی تحریر پر کیوں نہیں نظر ڈالتے۔ وہ لوگ جو عربی فارسی جزِ ثقیل اور خطابت کے دل دادہ ہیں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کی تحریریں پڑھیں اور لطف اندوز ہوں۔ جو لوگ سنجیدہ، متین اور علمی طرز تحریر کے دل دادہ ہیں وہ مولانا عبدالماجد صاحب بی اے اور ارباب دار المصنفین (اعظم گڈھ) کے طرز انشا سے سبق حاصل کریں۔ جو لوگ شستہ، سلیس اور آسان اُردو پر سر دھنتے ہیں ان کو مولانا عبدالحق صاحب بی اے سکریٹری انجمن ترقی اُردو کی تحریروں کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو لوگ رنگینی، لطافت، لوچ اور انشاء جمیل کے طلب گار ہیں ان کو مولانا نیاز فتحپوری کا اتباع کرنا چاہیئے کچھ لوگ حزن اور حسرت و غم کی مصوری پسند کرتے ہیں ان کو مولانا راشد الخیری (مصور غم) کی پیروی کرنی چاہیئے، مضحکات اور طنزیات کا رنگ مطلوب ہو تو ڈاکٹر نذیر احمدؒ، سجاد حسین اور سید محفوظ علی صاحب (خدا ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے) رنگ اختیار کیجئے، ٹھگوریت پسند خاطر ہو تو شباب اُردو کی صفحہ گردانی کیجئے۔ ٹھکیاں اور گدگدیاں منظور ہوں تو خواجہ حسن نظامی صاحب قبلہ کے ہاتھ پر بیعت کیجئے۔ بہرحال کوئی رنگ اور کوئی درجہ ایسا نہیں جو کسی نہ کسی شخص کے لئے موزوں نہ ہو۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا، ارباب وطن اُردو کو کیوں اس درجہ قابل عتاب تصور فرماتے ہیں۔ یہاں غالباً میرا یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ وہ لوگ جو اُردو کو مشکل بتاتے ہیں اس واقعہ سے بے خبر نہ ہونگے کہ کعبہ ہندوستان بنارس سے خود ایک ہندی کا روزانہ اخبار شائع ہوتا ہی جس کی عبارت خاص طور پر مشکل رکھی جاتی ہی اور اسی باعث سے اس کی اشاعت بھی کچھ بہت زیادہ اُمید افزا نہیں ہی۔ مالک اخبار سے اس حقیقت کا بار بار اظہار کیا گیا اور اس نے متعدد بار یہی جواب دیا کہ مالی مشکلات کی طرف سے کارکنان مطبع کو بے فکر رہنا چاہیئے، وہ ہر نوع اس کا کفیل رہے گا۔ اس کا مقصد صرف یہ ہی کہ عوام مشکل ہندی سمجھنے اور لکھنے کے عادی بنائے جائیں!

حضرات! بایں ہمہ ابھی اُردو میں اصلاحات کی گنجائش ہی نہیں بلکہ ضرورت ہی۔ میں اس سلسلہ میں فی الحال دو امور خاص طور پر آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں اول تو یہ کہ اُردو کی تعلیم

کیونکر دینی چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ اُردو لکھنے میں کن کن پابندیوں کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ مجھے افسوس ہے اور اپنے اس ہزیمت کی ندامت ہے کہ جس چیز کو میں سب سے زیادہ تکلیف دہ اور قابلِ پرہیز سمجھتا تھا وہ آج

تعلیمِ اُردو

مجھکو لامحالہ کرنی پڑتی ہے یعنی کسی موضوع بحث کا تجزیہ اور اس کی تقسیم اور ترتیب (با لفاظ دیگر Classification) تقسیم اور ترتیب فی نفسہ معقول چیز ہے اور ناظرین یا سامعین کو مرعوب کرنے کا اس سے بہتر اور موثر کوئی طریقہ نہیں ہے لیکن ذوقِ شعری اور لطفِ ادب کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھنا جو ایک ماہر علم فعال الحیات یا علم نباتات، کسی نقیب برشگال یا حسین شگوفہ کے ساتھ جائز رکھتا ہے، کہاں تک ہماری سخن فہمی اور ادب نوازی کی دلیل ہے ایک سوال ہے جس کا جواب بطیبِ خاطر نہیں تو کم سے کم بنظر تالیفِ قلوب آپ میرے موافق ہی دیں گے۔

حضرات! اس تقسیم اور ترتیب سے پہلے میں یہ عرض کرونگا کہ تعلیم اُردو کے لئے ہر معلم کو سب سے پہلے یہ حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ زبان کی تعلیم دیگر علوم اور فنون کی تعلیم سے بالکل مختلف ہے۔ زبان کے علاوہ بیشتر علوم ایسے ہیں جن کو آپ ایک حد تک متشکل کر کے ہر طالب علم کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ جغرافیہ اور تاریخ کی تعلیم آپ مختلف اقسام کی تصاویر، نقشوں اور خود مخصوص مناظر فطرت یا مقامات متعلقہ کو پیش نظر کر کے دے سکتے ہیں اور وہ بھی اس طور پر کہ وہ تمام عمر فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ سائنس کی تعلیم آپ اس طور پر دے سکتے ہیں گویا ہر طالب علم کے سامنے نوامیس فطرت خود بے نقاب ہو رہے ہیں۔ صنعت اور دستکاریوں کے نمونے آپ خود پیش کر سکتے ہیں اور ہر طالب علم ان کو دیکھکر اور چھو کر بسا اوقات جلد سے جلد ایک دستکار اور صنعت گر بن سکتا ہے۔ ایک شخص جلد سے جلد اسلحات کے استعمال سے واقف اور قواعد پریڈ سے آشنا ہو کر سپاہی بن سکتا ہے لیکن علم اور ادب کے میدان میں اعضا و جوارح کام نہیں دیتے۔ یہاں ذہن و دماغ کی کارفرمائی کی ضرورت ہوتی ہے اور ذہن و دماغ ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو مارشل لا یا ماسٹر صاحب کا خوف ہو۔ ان پر دسترس حاصل کرنے کے لئے ذہن و دماغ ہی سے کام لینا پڑتا ہے۔ ایک شخص جلد سے جلد شاعر بنایا جا سکتا ہے بلکہ بسا اوقات وہ شاعر پیدا ہی ہوتا ہے۔ لیکن کوئی شخص جلد سے جلد ادیب نہیں بنایا جا سکتا۔ ہر وہ چیز جو فطری ہے سہل ہے لیکن جہاں تربیت کی ضرورت ہوتی ہے یا تحصیل و اکتساب کا سوال آتا ہے وہاں ایسی دقتیں پیش آتی ہیں جن پر آپ سہولت کے ساتھ عبور نہیں حاصل کر سکتے اس لئے میں آپ سے درخواست کرونگا کہ آپ تعلیم زبان کے مسئلہ کو بالکل ایک جداگانہ نقطۂ نظر سے ملاحظہ فرمائیں۔ سب سے پہلے جس امر کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ متعلم نہیں بلکہ معلم سے متعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک خود معلم صاحب ذوق، ہمدرد اور ذہین نہ ہوگا وہ طلبا کو اپنے موضوع

تعلیم کا شائق نہیں بنا سکتا۔ آپ اس کلیہ کو ایک ادنیٰ حقیقت پر محمول کرینگے لیکن غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ ادبیات کی تعلیم کے لئے ان صفات کی موجودگی لازمی ہے۔ بہر حال اب میں ان صفات کے متعلق کچھ عرض کرونگا جو ایک اُردو معلم کے لئے میرے نزدیک ضروری ہیں۔

معلم کی صفات

(۱) معلم کو زبان فارسی پر کامل دستگاہ اور عربی پر وقوف حاصل ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں بھاشا کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) اُردو کے مشہور مصنفین کی تصانیف اور ان کا طرز انشا اس کی نظر میں ہو۔

(۳) مروجہ اُردو کے ہر پہلو سے اسے آشنا ہونا چاہیئے۔

(۴) وہ خود صاحب ذوق ہو اور طبیعت پر کسی قدر اجتہاد کا رنگ غالب ہو۔

حضرات! میں نے تعلیم اُردو کے لئے فارسی کو لازمی قرار دیا ہے۔ اس کے خاص وجوہ ہیں۔ اُردو کے عناصر ترکیبی کچھ ہی کیوں نہ ہوں اس حقیقت سے بمشکل انکار کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ اُردو زبان سے فارسی آب و رنگ حذف کر دیا جائے تو پھر گلستان کے بجائے صرف ایک فریب رنگ و بو رہ جاتا ہے۔ میرے بہت سے کرم فرما اُردو اور فارسی کو میرے ایک ہی سانس میں ادا کرنے سے شاید پہلو بدلنے لگیں۔

لیکن میں ان کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ فارسی آب و رنگ اور فارسیت میں فرق ہے۔ بے شک ایسی اُردو جس پر بے ربط فارسی کا اطلاق ہو یا جو غیر مانوس عربی الفاظ سے مرکب ہو، قابل پزیرائی نہیں ہے۔ اُردو کی تعمیر میں عربی اور فارسی کو جیسا کچھ دخل رہا ہے اسے آپ کم و بیش واقف ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُردو کو موجودہ حالت میں لانے کی جس حد تک یہ دونوں زبانیں ذمہ دار ہیں، اس کا تقاضا ہے کہ اس میں عربی اور فارسی کی آمیزش اب بھی اسی نسبت سے ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اردو اپنے ابتدائی مراحل طے کر چکی ہے اب ان اسباب اور ذرائع پر ضرورت سے زیادہ زور دینا روا نہیں ہے جن پر کاربند ہونا ابتدا میں ضروری اور لازمی تھا۔ میرا مقصد صرف ایک کلیہ پیش کرنے کا ہے، یعنی اُردو کے مصحف حسن میں فارسی خد و خال لازمی ہے یہاں خد و خال، محض حسن کی اضافی حیثیات نہیں ہیں اور اس کلیہ کو محض شاعرانہ حسن بیان پر محمول نہیں کرنا چاہیئے۔ پاکیزہ اُردو جسے میں بلا خوف تردید ہندوستان میں وہی حیثیت دینا چاہتا ہوں جو فرنچ کو مغرب اور فارسی کو مشرق میں حاصل ہے۔ فارسی کے بغیر ایک جسد بے روح ہے۔ نظر براں اگر معلم فارسی سے بالکل بے بہرہ ہے یا زبان سے آشنا ہے لیکن اس کی لطافتوں سے بیگانہ ہے یا اسے یہ ملکہ حاصل نہیں ہے کہ وہ کس طور پر فارسی کو اُردو کے مطابق بنا سکتا ہے، وہ طلبا کو یا تو صحیح راستہ پر نہیں ڈال سکتا یا ان کے ادبی ذوق کا معین نہیں ہو سکتا۔ کوئی شخص اس وقت تک اُردو کا اچھا معلم نہیں بن سکتا جب تک، نہ صرف اسے فارسی پر عبور ہو

بلکہ اُردو پر بھی کامل دسترس رکھتا ہو۔ ہندوستان میں بہت سے لوگ ملیں گے جن کی فارسی قابلیت مسلم ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اچھی اُردو بھی لکھ سکتے ہوں۔ بلکہ بعض مثالیں تو ایسی ملیں گی جہاں فارسی کا عالم متبحر اُردو کے میدان میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے۔ اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ ایک فارسی عالم اچھا اُردو نویس نہیں ہو سکتا۔ میرا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ جب تک کوئی اردو نویس اس حقیقت کو فراموش نہ کردے کہ اسے فارسی یا اُردو کے جرِ ثقیل پر پورا عبور ہے اس وقت تک وہ سلیس اور پاکیزہ اُردو لکھنے پر قادر نہیں ہو سکتا ایک تہمتن وقت سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ اپنے قوت اور صلابت کو بر سرکار لاکر راستہ میں بڑی بڑی سنگلاخ چٹانیں یا اتنا ور درختوں کو لاکر ڈال دے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ جس راستہ کو اختیار کرے اس کے دشواریوں کو ایسا دُور کرتا جائے کہ دوسروں کو چلنے میں آسانی ہو یا اس راستہ کو اختیار کرنے کی لوگوں میں جرأت پیدا ہو۔ اس لئے ہر معلم کا فرض ہے کہ وہ جس راستہ کو اختیار کرے اسے اتنا سہل گزار بنا دے کہ اس کے پیروؤں کو چلنے میں سہولت اور آسانی ہو۔ اچھے اُردو نویس کم ایسے دیکھے گئے ہیں جن کو فارسی پر کم و بیش عبور نہ ہو۔ اردو داں حضرات کو ابھی نہیں معلوم ہے کہ ادبیات کی کتنی شاہراہیں ہیں اور ان سے کس طور پر عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ علمائے فارسی ان تمام مراحل سے گزر چکے ہیں ان کو معلوم ہے کہ کس سفر اور کس راستہ میں کس قسم کی زادِ راہ یا اسباب کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس میں شک نہیں بہت سے علوم ایسے ہیں جہاں اُردو کی رسائی فی الحال ناممکن ہے لیکن اگر آپ اُردو کے استعداد جذب اور قوت اکتساب پر غور فرمائیں گے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ دشواری ایسی نہیں ہے جہاں صبر و شکر کے سوا کوئی دوسرا چارہ نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں عربی کے متعلق بھی اظہارِ خیال ضروری ہے۔ عربی مشتقات اور مصادر اگر کام میں نہ لائے جائیں تو پھر اُردو ایک بے مایہ زبان رہ جاتی ہے۔ عربی ترکیبیں بعض اوقات اُردو کی بہت سی مشکلات دُور کردیتی ہیں۔ بالخصوص تراجم میں عربی کی کارفرمائی ناگزیر ہو جاتی ہے اُردو میں جدید اصطلاحیں وضع کرنے میں جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُن سے کچھ وہی لوگ واقف ہیں جن کو اس فریضہ سے آج کل عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ اس میں شک نہیں بعض اوقات ہندی الفاظ بھی نہایت سہولت کے ساتھ کھپ جاتے ہیں لیکن ان میں خرابی یہ آن پڑتی ہے کہ تصریفی سہولتیں تقریباً ناممکن ہو جاتی ہیں۔ عربی میں اس کی کافی گنجائش ہوتی ہے۔ دوسری زبان کے اسماء اور کبھی کبھی افعال جب اُردو میں منتقل ہوتے ہیں اس وقت ہم کو اکثر عربی سے مدد لینی پڑتی ہے اس طور پر ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اُردو کا دامن اُن تمام چیزوں کے لئے وسیع اور رموز دں ہے جن پر عربی اور فارسی کا عمل ہو چکا ہو۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ معمولی معمولی الفاظ بھی عربی اور فارسی کی زد میں ثقیل اور گراں بنا دیئے جائیں۔ اس سے صرف یہ مقصود ہے کہ مختلف آوازوں کو ایک ہی ساز سے ہو کر

گزرنا چاہیے تاکہ موسیقی مکمل اور مرتب ہو اور سامع کو لطف اندوز ہونے کا موقع مل سکے۔ رہی بھاشا اس کے متعلق مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس میں علمی زبان ہونے کی کچھ زیادہ گنجائش نہیں ہے البتہ انشائے لطیف میں اس کا تصرف بعض اوقات نہایت سحر کارانہ ہو جاتا ہے لیکن ایسی حالت میں جس صنعت کارانہ انداز بیان کی ضرورت ہوگی وہ آپ پر ظاہر ہے۔

حضرات! دوسری صفت جو میں نے معلم کے لئے لازمی قرار دی ہے، اس کا اُردو مطالعہ ہے، یعنی اُردو کے مشہور مصنفین اور انشا پردازوں کی تصانیف اس کے مطالعہ سے گزری ہوں۔ میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں کہ اگر معلم پر صرف 'فارسیت' غالب ہے تو وہ طلبائے اُردو کے لئے ایک بہتر معلم نہیں بن سکتا ایک اُردو معلم کے لئے یہ ازبس ضروری ہے کہ وہ اُردو کے مد و جزر، اس کے سموم و صبا، اس کی زیر و بم سے بھی واقف ہو۔ اُسے یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ اُردو، فارسی کا محض ایک ضمنی حصہ نہیں ہے بلکہ اس سے بالکل علیحدہ اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے، اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ فارسی نغمے اُردو ساز سے کس طور پر نکالے جا سکتے ہیں اُردو اور فارسی میں جو تناسب اور تعلق ہونا چاہیئے اسے میں شاعر کی زبان میں یوں ادا کروں گا ؎

با من آویزشِ او الفتِ موج ست و کنار

دمبدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من

حضرات! تیسری صفت میں نے یہ پیش کی تھی کہ مروجہ اُردو کے ہر پہلو پر اس کی نظر ہونی چاہیئے اس شرط پر میں اس لئے زور دیتا ہوں کہ اس وقت وسائل آمد و رفت میں ترقی ہو رہی ہے، مختلف خیالات متصادم ہو رہے ہیں، مختلف زبانیں مخلوط ہو رہی ہیں۔ اس کسر و انکسار سے اُردو بے نیاز نہیں رہ سکتی اُسے اس کا لحاظ رکھنا پڑے گا کہ موسم کس قسم کے برگ و ثمر کا ہے۔ آج کل جس اُردو کی ضرورت ہے وہ ہم پر پوشیدہ نہیں ہے۔ اس وقت اگر کسی نے طلسم ہوش ربا یا فسانۂ عجائب کی داستان چھیڑی تو وہ یقیناً بے محل ثابت ہوگی۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ معلم کو مرغ باد نما بن جانا چاہیئے کہ جدھر ہوا کا رخ ہو وہ پھر جایا کرے بلکہ اسے اس امر کا اندازہ لگاتے رہنا چاہیئے کہ کون سے اصول اس وقت برسر کار، وہ کہاں تک مفید یا غیر مفید ہیں اور ان سے کس طور پر عہدہ برآ ہونا چاہیئے۔

حضرات! چوتھی صفت یہ تھی کہ معلم کی طبیعت پر کسی قدر اجتہاد کا رنگ غالب ہونا چاہیئے تیسری اور چوتھی صفتیں ایک حد تک لازم و ملزوم ہیں۔ اُردو کی سب سے بڑی محرومی جو آج کل ہمارے نوخیزوں میں نمایاں ہے وہ فقدانِ اجتہاد ہے۔ میرے تعجب اور صدمہ کی انتہا نہیں رہتی جب میں ہمیشہ اپنے طلبا کو دیکھتا ہوں کہ وہ وہی فرسودہ لکیریں پیٹتے چلے جاتے ہیں جو اب اس قابل بھی نہیں رہیں کہ کوئی صاحبِ ذوق

وبصیرت اُن کی طرف نگاہ اُٹھاکر بھی دیکھے۔ میں اپنے لکچر کے اس حصّے کو خاص طور پر اپنے عزیزانِ گرامی طلباے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے غور و توجہ کے لئے مخصوص کرتا ہوں، مجھے اُمید ہی، میرے دوسرے بزرگ اور کرم فرما بھی اس پر توجہ فرمائیں گے۔ مضمون طویل ہوتا جاتا ہی داستان ہی کہ ختم ہونے کو نہیں آتی ؎

شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ میخیزد

جھاپیلزم حضرات! آپ کسی اُردو مضمون کا مطالعہ فرمائیں جو آج کل کثرت کے ساتھ معمولی رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کو بہت جلد محسوس ہونے لگے گا کہ ہر مضمون نگار کا طرزِ انشا تقریباً یکساں ہیں، الفاظ اور جملوں کی دروبست ایک ہی۔ ابتدا اور انتہا میں بھی وہی دیرینہ فرسودگی چلی آتی ہی۔ حسنِ مذاق اور جودت کے معنی صرف ضلع جگت یا پامال تشبیہات اور استعارے رہ گئے ہیں۔ میں نہایت جس چیز کو انتہائی بد مذاقی تصور کرتا ہوں وہ ضلع جگت اور رعایت لفظی ہی۔ اس افتاد طبع نے ہمارے مذاق کو پھیکا اور ہمارے تحریر و تقریر کو بالکل سطحی اور عامیانہ بنا رکھا ہی۔ عرصہ ہوا ہمارے چند صاحب ذوق احباب نے علی گڑھ میگزین میں ایک ایکٹ شائع کیا تھا جو سنجیدہ ظرافت کا بہترین نمونہ تھا۔ ضلع جگت سوقیانہ پھکڑ بازی، مصنوعی ناز و انداز، فرسودہ اشعار یا ضرب الامثال کو موقع بے موقع استعمال کرنا، ان تمام لغویتوں کے خلاف ایک ایکٹ تعزیرات پاس کیا گیا تھا، مجھے افسوس ہی کہ نسبتاً بہت کم لوگوں نے اس کا مطالعہ کیا لیکن جن لوگوں کی نظروں سے یہ ایکٹ گزر چکا ہی وہ اس کے زد سے محفوظ رہنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں اور بعض حلقوں میں تو اس ایکٹ کو کلاسکس کی حیثیت حاصل ہی۔ انتہائی جزئی فروگزاشت بھی اس کی گرفت میں آجاتی تھی۔ ضلع جگت اور رعایت لفظی کو خاص طور پر قابل گرفت بتایا گیا تھا، اس ایکٹ کا نام جھاپیلزم تھا اور اُن جرائم کے مرتکب کو جو اس ایکٹ کی تحت میں آتے تھے، جھاپیل کہا جاتا تھا۔ اس کی دو ایک مثالیں پیش کرنا ضروری ہیں مثلاً

ایک صاحب فرماتے ہیں "خدا سے آس ہی کہ آپ پاس ہو جائیں، ہال میں پاس پاس بیٹھئے اور آس پاس کی خبر لیتے رہئیے یاس کو پاس نہ پھٹکنے دیجئے اور ہر حال میں خدا کا سپاس ادا کیجئے"

دوسرے صاحب فرمانے لگے "یہ شیر بر بنج نہیں شیر بے رنج ہی آپس میں شیر و شکر ہو جاتے تو شہر کا شیر پاس نہ آئے گا"

تیسرے صاحب یوں گلفشانی کرتے ہیں۔ زنجبار میں بار بار ادبار کو بار نہ دیجئے۔

ایک بزرگ کا ارشاد ہوتا ہی۔ تجنذی نے کنڈی نہیں کھولی اس کی کُنڈی کیجئے۔

ایک صاحب حاذق صاحب سے ملتے ہیں، فرماتے ہیں "آپ نے خوب ترکیب سوجھی آخر حاذق ہی ٹھہرے"
ایک صاحب نے فرمایا "بھئی لوٹا نہیں ملتا"، دوسرے نے جواب دیا کہیں لوٹا ہوگا، پہلے صاحب نے
پھریری سے لے کر فرمایا "بھئی لوٹا گیا ہوگا۔ تو دوسرے صاحب نے ارشاد کیا "کیا لوٹا نہیں دیا گیا"
اور اس کامیابی پر قہقہہ لگا کر لوٹ گئے (معاف کیجئے!)

اس قسم کی مثالیں نہایت کثرت کے ساتھ آپ نہایت مہذب اور تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی پائیں گے
اگر سچ پوچھئے تو یہ بد مذاقی اور سطحیت کی نہایت رکیک مثال ہے۔ آج کل لوگوں نے اس کو برجستہ گوئی
حاضر جوابی اور ظرافت میں شمار کرنا شروع کر دیا ہے۔ بعض لوگ جو رنگین یا ظریفانہ طرز انشا کے پیچھے
بُرے طور پر پڑے رہتے ہیں اس قسم کی تحریروں کو اپنی جودت اور فطانت پر آخری لفظ تصور کرتے ہیں
ان کو کیا معلوم اس قسم کی باتیں مہذب اور باسلیقہ لوگوں کے نزدیک کیا حقیقت رکھتی ہیں۔ چھاپلزم ایکٹ
کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ کسی "پُرمذاق" جملہ کو جسے سن کر ایک دفعہ لوگ محظوظ ہو چکے ہیں بار بار دہرانا
اور پھر لوگوں سے پذیرائی کی توقع رکھنا بھی چھاپلزم ہے۔ اس ایکٹ کی زد میں وہ مصنف بھی آجاتا ہے جو
یہ دیکھ کر کہ اس کا کوئی مضمون یا کوئی تصنیف بے حد مقبول ہو چکی ہے اسی قسم کی دوسری تصنیف پبلک میں
پیش کرتا ہے اور شرفِ قبولیت کی توقع رکھتا ہے۔ مثلاً ملٹن کا پیراڈائز لاسٹ لکھنے کے بعد پیراڈائز ریگینڈ
کا لکھنا صریحی چھاپلزم تھا۔ کسی ایک ہی موضوع کو بار بار معرض بحث میں لانا یا اپنے ہی قول کو بار بار
پیش کرنا اور وہ بھی انتہائی شد و مد کے ساتھ، کسی طرز انشا کی اس طور پر نقل کرنا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ
یہ خواہ مخواہ کے سلسلہ میں ہے، فرسودہ اور پامال شعر یا ضرب المثل کو کسی نہ کسی طور پر دوران تحریر یا
تقریر میں پیش کرنا، یہ سب چھاپلزم میں داخل ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے بار بار ایک بزرگ یاد آتے ہیں
جنھوں نے ایک ضرب المثل کچھ اس بے ساختگی کے ساتھ استعمال کی کہ میں ان کے حسن مذاق کا اب تک
معترف ہوں۔ یہ صاحب کچھ ایسے تیز گفتار تھے کہ کوئی شخص ان کی گفتگو بہ مشکل سمجھ سکتا تھا۔ اپنا ایک واقعہ
یوں بیان فرمانے لگے:

"صاحب مجھے آگرہ سے علی گڑھ آنا تھا، نہایت ضروری کام درپیش تھا، بارش ہو رہی تھی اور
میرے پاس اسباب ضرورت سے زیادہ تھا۔ کیا بتاؤں کس دقت سے آگرہ سے سوار ہوا، ٹونڈلہ پہنچنے پر
معلوم ہوا کہ علی گڑھ جانے والی گاڑی چھوٹ گئی ہے، الانسان مرکب من الخطاء والنسیان
ناچار رات وہیں رہ گیا۔"

تیز گفتاری کا یہ عالم تھا کہ وہ ٹونڈلہ پہنچ گئے تھے اور میں ان کے "اسباب" کے ساتھ آگرہ ہی

میں تھا۔ اس ضرب المثل کا پیش کرنا تھا کہ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی مرض متعدی تھا میں نے بھی کہدیا
"از خورداں خطا و از بزرگاں عطا"

حضرات! آپ یقین فرمائیں میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ بے کم و کاست صحیح ہے۔ آج کل جتنے مضامین شائع ہوتے ہیں ان میں بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو معقول کہے جا سکتے ہیں، مثال کے طور پر میں چند عنوانات آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں اور آپ ہی کو منصف قرار دیتا ہوں کیا یہاں ان چند فرسودہ، دور از کار، مہمل اور مبتذل خیالات کے علاوہ کچھ اور مل سکتا ہے؟ باغ و بہار پر مضمون لکھنا ہوا تو غنچے کا مسکرانا، پتیوں کا تالیاں بجانا، نرگس کی نظر بازی، سوسن کی زبان درازی، سنبل کی زلف چوٹی، بلبل کی غزل خوانی، گویا باغ نہ ہوا کسی بازاری عورت کا بالاخانہ ہوا، اس کے بعد باغباں کی برچھی، سرو کا چلنا، سبزہ کا مخمل ہونا، ہوا کا سائیں سائیں کرنا، فوارے کا آٹھ آٹھ آنسو رونا وغیرہ آتا ہے اس سلسلہ میں دو تین اشعار پڑھے جاتے ہیں مثلاً

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے ــــــ حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے
نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی ــــــ تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
اجاڑا موسمِ گل ہی میں آشیاں اپنا ــــــ الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد

اس کے بعد صیاد کا دام نظر آ جاتا ہے کبھی بلبل کے ساتھ رونا پیٹنا شروع کیا جاتا ہے اور یہ شعر پڑھ دیا جاتا ہے ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں ــــــ تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

پھر کسی کنج میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں محبوب کا کوئی پرزہ نکال کر پڑھا جاتا ہے، انگلیاں کانپنے لگتی ہیں، خط کو بوسہ دے کر سینہ میں رکھ لیا جاتا ہے اور اس کے بعد خودکشی کر لی جاتی ہے۔

موسم اور مناظر فطرت کو کبھی اس طور پر بھی "باندھیں گے"

"آسماں ماتمی لباس پہنے ہوئے ہے۔ شفق خون رو رہی ہے یا ہنس رہی ہے، پانی برستا ہے تو فرماتے ہیں

یہ کہدو ابر باراں سے اگر برسے تو یوں برسے ــــــ کہ جیسے مینھ برستا ہے ہمارے دیدۂ تر سے

روم جھوم، چھم چھم، دھڑ دھڑ۔ کہیں طاؤس ناچتا ہے، کوئل کوکتی ہے، پپیہا پی کہاں کہتا ہے، جوانانِ چمن کا غسل ہوتا ہے، کالی رات کالی بلا ہے۔ ستارے ٹمٹماتے ہیں (اگر طبیعت طاری ہوئی تو دو ایک آسمانی نغمے بھی ان سے سُن لئے) چاند محبوب کا چہرہ ہے، کبھی بادلوں کی چادر ڈال لیتا ہے، کبھی ہوا گستاخ بادلوں کو تھپیڑے دے دے کر ہٹا دیتی ہے اور کبھی حضرت عاشق یا شاعر خود اس کی زد میں آ جاتے ہیں!

محبوب کا سراپا کھینچیں گے تو آنکھیں تیر و سنان و خنجر برسانے لگیں گی، کبھی ساغر لنڈھائیں گی۔

رخسارے ہیں کہ سیب کشمیری، موںھ غنچہ، گردن صراحی دار، دیکھتے ہی، ہائے، وائے، آہ، اُوہ، اُف، ظالم، کافر کہکر بے ہوش ہو جائیں گے، بہت خوش قسمت ہوئے تو آنکھ کھولنے پر اپنا سر زانوے یار پر پائیں گے اور آخر میں لکھ دیں گے۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا!

بعض حضرات جن کی طبیعت کسی قدر اعتدال پسند ہوتی ہی جب کبھی قلم اٹھائیں گے تو کوئی نہ کوئی پامال شعر ضرور لکھیں گے۔ فرض کیجئے "اتفاق" پر مضمون لکھنا ہوا تو سب سے پہلے لکھیں گے۔

(۱) دو دل یک شود بشکند کوہ را —— پراگندگی آرد انبوہ را

(۲) ہر کارے کہ ہمت بستہ گردد —— اگر خارے بود گلدستہ گردد

(۳) ہمت مرداں مدد خدا۔

اس کے بعد کہیں نہ کہیں اس قصہ کو لکھیں گے جو ایک قریب المرگ باپ اور اس کے نصف درجن یا اس سے زیادہ لڑکوں سے متعلق ہی، باپ کا رسّی کے مختلف ٹکڑوں کا دینا اور ان کو ملا کر توڑنے کی فرمائش کرنا اس کا نہ ٹوٹنا اور علیٰحدہ علیٰحدہ ان کا ٹوٹ جانا وغیرہ وغیرہ۔

ہماری بد مذاقیاں یہیں نہیں ختم ہو جاتیں، شادی اور غمی میں بھی ہم انھیں فرسودگیوں کو ملحوظ رکھتے ہیں کوئی رقعۂ دعوت آپ ان اشعار یا جملوں سے خالی نہ پائیں گے۔

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست —— آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید

رواقِ منظرِ چشمِ من آشیانۂ تست —— کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

گر قبول افتد زہے عز و شرف

تعزیت اور ماتم پرسی کے لئے بھی چند ہی اشعار اور جملے مخصوص ہیں مثلاً

موت سے کس کو رستگاری ہی —— آج وہ کل ہماری باری ہی

صبح کو طائرانِ خوش الحان —— پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

"دنیا فانی ہی" "صبر و شکر کے سوا کیا چارہ ہی" "مرحوم کو جوار رحمت اور پسماندگان کو صبر جمیل" وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ان سب سے زیادہ خطرناک وہ طبقہ ہی جس نے ٹگور کا رنگ اختیار کیا ہی۔ ان کو کس طرح بتایا جائے کہ یہ چیزیں کبھی کبھی بطور تفریح اچھی معلوم ہوتی ہیں مستقل مضامین کا اسی پیرایہ میں پیش کرنا

اُردو پر صریحی ظلم ہے اور ذوق ادب کو مجروح کرنا ہے۔ مثلاً

وہ ... ... باغ ... ... پھول ... ... آہ تم مسکرائے ... ... ندی کے کنارے
پانی کا گھڑا ... ... آسمانی نغمہ ... ... تاروں کا راگ !

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو گھوم پھر کر کسی ایسے مضمون کو اختیار کریں گے جس میں غلام امام شہید کا رنگ کھپ جائے۔ اور وہ بھی ایسا جو " روضہ تاج گنج" کے نمونہ کا ہو۔ بعض حضرات، جو ہندوستان کی موجودہ پالیٹکس پر اظہار خیالات فرمانے کے شائق ہوتے ہیں، نفسِ مضمون کے اعتبار سے محض چند مخصوص الفاظ اور ترکیبوں کے پابند ہوتے ہیں، مضمون کچھ ہی کیوں نہ ہو، عبارت میں زور ہو یا نہ ہو، خیالات کیسے ہی ہوں موقع یا ہو یا نہ ہو، اس سے کوئی ربط یا تسلسل پیدا ہوتا ہو یا نہیں چند الفاظ اور ترکیبیں کہیں نہ کہیں کھپا دینا ضروری ہیں مثلاً مادرِ ہند، طوقِ غلامی یا لعنت، شیطنت، ہندوستان کے سپوت فرزند، وغیرہ وغیرہ

آخری طرز انشا کے متعلق میں نے جو اظہار خیال کیا ہے اس سے ممکن ہے بعض حضرات میری خلوص نیت کو مشکوک سمجھنے لگیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ مجھے جس سے نفرت ہے وہ کورانہ تقلید ہے۔ مضمون میں محض آب و رنگ پیدا کرنے کے لئے چند ایسی ترکیبوں، جملوں کو معرض تحریر میں لانا جو بجائے خود نہایت سنگین اور گراں ہوں اور جن کے لئے انتہائے حزم و احتیاط لازمی ہے، بالکل بے محل ہوتا ہے۔ میں بذاتہٖ ہر ایسے مضمون کو مہمل اور بے سود سمجھتا ہوں جس کے پڑھنے سے لوگوں کی معلومات میں کوئی اضافہ نہ ہو یا نفس مضمون سے لوگوں کے قلب و دماغ مسرور یا متاثر نہ ہوں۔ اس سلسلہ میں میں اپنے عزیزانِ مسلم یونیورسٹی کو خاص طور پر مخاطب کرنا چاہتا ہوں کیونکہ کل انھیں کے جنبش قلم پر قوم اور ملک کی نظریں لگی ہونگی، علم و فضل کا سرمایہ انھیں کے کاوش دماغ اور مذاقِ سلیم کا محتاج ہوگا اور رزم و بزم انھیں کے آداب و اطوار کا آئینہ ہوگی۔

عزیزانِ گرامی، کیا تم کو کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ تمھاری اس قسم کی تحریروں سے جن کا خاکہ میں ابھی ابھی کھینچ چکا ہوں تمھارے اجتہادِ فکر اور مذاقِ سلیم کی رسوائی ہوتی ہے۔ تم نے اپنی استعداد اور قابلیت کا معیار اتنا پست کیوں کر دیا ہے جو لوگ تم سے قبل گزر چکے ہیں ان سے تم اپنے آپ کو اگر قابل تر نہیں ثابت کر سکتے تو کیا تم میں ان کی سچے جانشین بننے کی بھی اہلیت نہیں ہے۔ کیا فطرت کا بیکراں سرمایہ تمھارے لئے نہیں ہے۔ کیا تمھاری فکر نئے فضائے تخیل میں پرواز کرنے سے عاری ہے۔ کیا کائنات کا ذرّہ ذرّہ تم کو دعوتِ دید نہیں دیتا اور کیا تمھاری جودت ان سے آمیز ہو کر تمھارے لئے نئی نئی دنیائیں نہیں پیدا کر سکتی، کیا تم خود کیف و حس سے محروم ہو، اور کیا تم ان کو اس طریقہ سے نہیں بیان کر سکتے جیسا تم خود ان کو محسوس کرتے ہو کیا تم یہی پسند کرتے ہو کہ تمھارے جذبات، تمھارے خیالات، تمھاری فکر سب مستعار ہو، تم مجھے بتاؤ تمھارا

کسی باغ میں گزر ہوتا ہے تو تم وہی محسوس کرتے ہو جس کا نمونہ میں ابھی ابھی پیش کرچکا ہوں ۔ مجھے بتاؤ تم ان فرسودہ طریقوں کو اختیار کرکے اپنے جذبہ کی حقیقی ترجمانی کرتے ہو ۔ عزیزو ، یاد رکھو ہر انسان ہر چیز سے مختلف طور پر لذّت اندوز ہوسکتا ہے اور اپنے جذبات کی ترجمانی بالکل اچھوتے انداز سے کرسکتا ہے ۔ پھر ان باتوں کو کیوں نہیں لکھتے جو خود تمھارے دل پر گزرتی ہیں ، وہ باتیں کیوں لکھتے ہو جو شاید ان لوگوں کے دلوں پر بھی نہیں گزریں جن کی تم نقل کرتے ہو ۔ کیا تم اپنے دوستوں ، بزرگوں یا عزیزوں کو اپنے خیالات سے یونہی آشنا کراتے ہو پھر مجھے بتاؤ ایسا کیوں لکھتے ہو یا تو لکھنے سے قطعاً گریز کرو یا وہی لکھو جسے تم خود محسوس کرتے ہو ۔ تم کو کوئی بات کبھی نہیں لکھنی چاہیئے اگر تم ایمانداری کے ساتھ محسوس کرتے ہو کہ دوسرے تم سے اچھا لکھ چکے ہیں ، تم کو اپنا ایک مخصوص انداز قائم کرنا چاہیئے ، میں بتا چکا ہوں کہ ہر انسان ایک مخصوص رنگ کا مالک بن سکتا ہے ۔ تم اپنے عزیزوں دوستوں یا بزرگوں کو خط لکھتے ہو تمھارے مخاطب اس خط کو پاکر باغ باغ ہوجاتے ہیں یہ کیوں ؟ محض اس لئے کہ اس کا ایک ایک حرف ، ایک ایک جملہ طرزِ بیان ، ترتیب و تہذیب غرضکہ ہر وہ چیز جس پر تمھاری وہ تحریر مشتمل ہوتی ہے تمھاری ذات ، تمھارے جذبات ، تمھارے انداز اور تمھارے احساس کی ترجمانی کرتی ہے ۔ یہی کیفیت تمھاری ہر تحریر کی ہونی چاہیئے ، یہ بالکل مشکل نہیں ہے ، صرف مشق درکار ہے ، مطالعہ اور مشاہدہ کرو ، اپنے معلم خود بنو ، کوئی دوسرا شخص تمھارے گفتگو اور تمھاری تحریر کا تم سے بہتر جج نہیں ہوسکتا ۔ انشا پردازی کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ تمھاری تحریر تمھارے خیالات کی بے کم و کاست ترجمانی کرتی ہو ، پہلے سوچو اس کے بعد لکھو ، ایک انشا پرداز کی سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ وہ غور و فکر کرنے سے قبل الفاظ اور جملے اپنے ذہن میں ترتیب دے لے ، الفاظ ، جملوں یا مخصوص ترکیب اور بندشوں کے ترجمان نہ بنو بلکہ اپنے حسیّات اور جذبات کی صحیح اور سچی ترجمانی کرو ۔ کبھی ایسی کتابوں کا مطالعہ نہ کرو جن سے ادب اُردو کا خون ہوتا ہو ۔ سستے اور اخلاق کو پامال کرنے والے ناول کبھی نہ پڑھو ، اس سے تمھارا ادبی ذوق مجروح ہوگا ۔ تم سمجھتے ہوگے کہ میں محض فرسودہ پند اور موعظت پر آگیا ہوں اور ایک ایسے واعظ کی حیثیت اختیار کرچکا ہوں جو خود نہیں جانتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے ۔ یہ صحیح نہیں ہے ، میں خود ان منازل سے گزر چکا ہوں اور اس کی تلخیوں سے آشنا ہوں ۔ ایک بڑے زبردست حکیم کا قول ہے کہ اگر تم بڑا بننا چاہتے ہو تو چھوٹی باتوں سے گریز کرو ، میں چاہتا ہوں کہ یہ مقولہ کم سے کم تمھارے ادبی زندگی کا خضر راہ ہو ۔ آج جس لکیر کو تم پیٹ رہے ہو اس کی تنہا وجہ یہ ہے کہ تمھاری تعلیم کے ابتدائی دور میں صرف ناکارہ تصانیف مطالعہ میں رہی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ تمھارے قلب و دماغ تاریک ہورہے ہیں ۔ اُردو رسائل میں اس وقت معارف ، اُردو ، نگار اور اسی پایہ کے دوسرے رسائل کا مطالعہ کرنا چاہیئے ، ان مطبوعات کو اس نیت سے کبھی نہ پڑھو کہ تم کو ان کی طرزِ انشا

کی نقل کرنی ہی۔ ان کا مطالعہ صرف اس لئے ضروری ہی کہ تمھارا ذہن ودماغ ان سے ترتیب اور تہذیب حاصل کرے، جو کچھ پڑھو اسے اپنے انداز میں لکھنے کی کوشش کرو، ان کے طرز تحریر سے تمھارا ذہن ودماغ سلجھے گا اس کے بعد جو کچھ تم لکھوگے وہ روشن، مربوط اور دل نشیں ہوگا۔ جن انشا پردازوں کے متعلق میں اس سے قبل اظہار خیال کر چکا ہوں ان میں دو بزرگ ایسے ہیں جن کی تقلید نہایت مشکل اور خطرناک ہی۔ ان امور میں تقلید یوں بھی مستحسن نہیں ہی لیکن مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اور خواجہ حسن نظامی صاحب کا طرز انشا لائڈ جارج کی کولیشن وزارت ہی۔ جس طرح صرف لائڈ جارج ہی کی ذات ایسی تھی جو کولیشن کی کشتی کو کامیابی کے ساتھ چلا سکی اسی طرح مولنا آزاد اور خواجہ صاحب کا طرز کچھ انھیں حضرات سے نبھ سکتا ہی۔

"صلاح ومشورہ"

حضرات، اردو زبان اور موجودہ دور کے متعلق مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا وہ کم وبیش عرض کر چکا۔ اب میں اپنے فرض کے اس حصہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جس سے بڑھکر آسان دنیا میں کوئی چیز نہیں ہی، یعنی صلاح اور مشورہ! قبل اس کے کہ میں کچھ اور عرض کروں اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اس وقت دہلی اور لکھنؤ دونوں اردو کی طرف سے انتہائی استغنا برت رہے ہیں حالانکہ ان دونوں مقامات پر یونیورسٹیاں قائم ہو چکی ہیں اور ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں، لیکن مجھے افسوس ہی یہ خانقاہیں صرف اپنے گزشتہ سجادہ نشینوں کی سوگوار ہیں، کنعان اور مصر دونوں ویران ہیں اور متاع یوسفی کے لئے آنکھیں بے قرار ہونے لگی ہیں۔ اب وہ دن دور نہیں ہی جب ہماری مایوس نگاہیں صرف حیدرآباد کی فضا کو اپنا نشیمن بنائیں۔ جنوبی ہند کے اردو پر جو کچھ احسانات رہے ہیں ان سے آپ واقف ہیں۔ کیا تعجب زمانہ کا انقلاب انھیں لیل ونہار کو پھر ہمارے سامنے کردے جن کی کروٹیں کبھی اردو کی گھوارہ جنبانی کر چکی تھیں۔

حضرات! اس سلسلہ میں میں خود علی گڑھ کی ذمہ داریوں کا بھی تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ اردو کا نیا شمس علی گڑھ ہی میں طلوع ہوا اور دشمنان اردو کا مقابلہ بھی ہمیشہ اسی محاذ سے کیا گیا۔ دلی اور لکھنؤ کے بعد اردو کا پرستش کدہ علی گڑھ ہی رہا۔ لیکن افسوس ہی کہ اس وقت ہم اپنی ان تمام ذمہ داریوں کو بھول چکے ہیں جو سر سید، محسن الملک، نذیر احمد، شبلی، حالی اور آزاد سے منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہونچی ہیں۔ مشکل یہ ہی کہ موجودہ حالات کچھ اس درجہ متناقض اور ہماری قوتِ عمل اس درجہ ناکمل ہی کہ ہم کسی قطعی فیصلہ پر پہنچنے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ آپ حضرات نے مہمات جیسن میں وہ قصہ تو ملاحظہ فرمایا ہی ہوگا جہاں جیسن کے جہاز کو دو ایسی چٹانوں سے گزرنا پڑا تھا جن کے درمیان سے کوئی چیز گزرتی تو وہ یکلخت ایک دوسرے سے ٹکراتیں اور اسے پرزہ پرزہ کرکے پھر علیحدہ ہوجاتیں۔ اس طور پر کوئی چیز ان دونوں کی زد سے محفوظ رہ کر نہیں نکل سکتی تھی ایک حد تک یہی حالت ہمارے انسٹی ٹیوشن کی ہی۔ ہماری کشتی اس وقت آکسفورڈ اور غرناطہ کے درمیان

میں ہے۔ دیکھئے کیا حشر ہوتا ہے۔

حضرات! اس وقت اس مسئلہ کا چھیڑنا مصلحت نہیں ہے کہ علی گڑھ کو کیمبرج اور آکسفورڈ بنایا جائے یا قرطبہ اور غرناطہ، مجھے اس سے کوئی بحث نہیں ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس بحث مباحثہ کے ساتھ آکسفورڈ یا غرناطہ کا سا کچھ کام بھی ہوتا رہے، اُردو کی حیثیت کیسی ہی کچھ کیوں نہ ہو، وہ ہماری توجہ کی محتاج ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ ہم کو اپنی تمام تر قوت اسی پر صرف کر دینی چاہیئے۔ استدعا صرف اتنی ہے کہ ہم کو اپنی تمام تر قوت اس کے خلاف نہیں بر سر کار لانا چاہیئے۔ خدا مسلمانوں کو قائم رکھے ابھی بہت سے مواقع ایسے آئیں گے جہاں وہ 'تماشا' کو 'کامیاب' اور 'تمنا' کو 'بے قرار' رکھ سکیں گے۔

لائبریری

حضرات! سب سے بڑی ضرورت جس سے ہم کو عہدہ برآ ہونا ہے اُردو کی ایک جامع لائبریری کا قیام ہے۔ یوں تو یہ ضرورت بظاہر نہایت خفیف اور معمولی نظر آتی ہے لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ اس کام میں ہم کو انتہا سے زیادہ سعی و کوشش سے کام لینا پڑے گا۔ اس وقت کم و بیش اُردو کی آٹھ ہزار مطبوعات ہیں اور ہر نسخہ کی قیمت کا اوسط عہ رکھ لیا جائے تو آٹھ ہزار روپئے تو صرف کتابوں کی قیمت ہونگے۔ اس وقت ہندوستان میں اُردو کتابوں کا کوئی مکمل کتب خانہ نہیں ہے اور یہ ایک ایسا افسوس ناک واقعہ ہے جس کا ہم کو احساس ہونا چاہیئے، کتب خانہ کی اہمیت پر اظہار خیال کرنا میرے نزدیک تحصیل حاصل ہے۔ رہا یہ امر کہ کتب خانہ اسی پیمانہ کا ہونا چاہیئے یا نہیں جس کا میں نے تذکرہ کیا ہے اس کے متعلق صرف یہ کہنا ہے کہ اس کی ضرورت اگر علی گڑھ کو نہ ہوگی یا اس ضرورت کو علی گڑھ نے پورا نہ کیا تو پھر کس سے توقع رکھی جائے۔ میرا خیال ہے کہ جب تک اُردو کی ایک مکمل اور جامع لائبریری نہ ہوگی ہماری مساعی کا شیرازہ کبھی استوار نہ ہو سکے گا۔

انجمن اُردوئے معلیٰ

دوسری ضرورت یہ ہے کہ علی گڑھ میں ایک اُردو انجمن قائم کی جائے، جس کے ارکین وہ لوگ ہوں جن کو اُردو سے شغف ہے یا جو اُردو کی ترویج اور ترقی کو اپنا مشن خیال فرماتے ہیں۔ اس انجمن میں ہفتہ وار یا ماہوار اُردو کے معرکۃ الآرا مسائل پر عالمانہ مضامین پڑھے جایا کریں، اور ان پر سنجیدگی اور فرزانگی کے ساتھ تبادلہ آرا کیا جائے۔ اس انجمن کی کامیابی ارباب یونیورسٹی اور اراکین انجمن کی پر خلوص مساعی پر ہے۔ انجمن کا ایک ادبی رسالہ ہونا چاہیئے جس میں ان مضامین کو شائع کیا جائے اور وقتاً فوقتاً چھوٹے چھوٹے رسائل شائع ہوتے رہیں جن کا مبحث اُردو سے متعلق ہو۔ مثلاً اُردو کیوں کر مقبول انام بنائی جا سکتی ہے، رسم الخط، اُردو صحیح لکھنے اور بولنے کے فوائد اور قواعد، تعلیم اُردو، اُردو انشا پردازی، اُردو ترجمے اور تالیفات، مشہور شعرائے اُردو

اور فارسی کے منتخب کلام مع مقدمہ، فرہنگ اور حاشیہ، مشاہیر ملک وقوم کے سوانح زندگی جو بچوں اور کم لکھے پڑھے لوگوں کے لئے مفید ہوں، خوشنویسی اور اس کا فن، خطاطی، قومی اور نیچرل نظمیں وغیرہ وغیرہ اس رسالہ میں مشہور مطبوعات پر فاضلانہ نقد اور تبصرے ہوں تاکہ لوگوں میں تنقید صحیح کا ملکہ پیدا ہو اور وہ مشہور مطبوعات سے آشنا ہوسکیں، فی الحال میں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ انجمن اردوئے معلیٰ کا احیا کیا جائے اور رسالہ کا نام اردوئے معلیٰ رکھا جائے، اس کی ترتیب اور تہذیب معارف اور اردو کے نمونے پر ہو اور سال میں چار بار شائع ہوا کرے۔

کانفرنس معلمین اردو

تیسری ضرورت جس کی نوعیت ایک حد تک نیم سرکاری ہوگی یہ ہے کہ ہر سال ان معلمین اردو کی ایک کانفرنس منعقد ہوا کرے جن کا تعلق مختلف یونیورسٹیوں سے ہو مثلاً علی گڑھ، لکھنؤ، دہلی، بنارس، حیدرآباد، پنجاب، بمبئی۔ وہ لوگ جو ان یونیورسٹیوں میں شعبۂ اردو سے تعلق رکھتے ہیں، ہر سال مجتمع ہوکر ان تدابیر اور اسباب پر غور کیا کریں اور حتی الوسع ان کو عمل میں لانے کی کوشش کریں جو کانفرنس کے نزدیک ضروری اور قابل عمل ہوں۔ اس کانفرنس کی نوعیت دیگر اس قسم کی جماعتوں کی نوعیت سے بالکل مختلف ہوگی، اس کے اراکین وہ ہونگے جن کا براہ راست اردو کی تعلیم اور نشر و تعمیم سے تعلق ہوگا اور یہ لوگ اپنے مخصوص مقامی ضروریات کو مدنظر رکھکر مناسب تدابیر عمل میں لائیں گے۔ جہاں تک براہ راست اردو کی درس و تدریس کا تعلق ہے معلمین کی یہ کانفرنس بے حد ضروری ہے اور اگر کامیابی کے ساتھ چلائی جاسکے تو میرا خیال ہے اس سے نہایت عمیق اور دوررس نتائج مترتب ہونگے۔

اکاڈمی

چوتھی ضرورت جس کا میں اس سے قبل اعادہ بھی کرچکا ہوں ایک اکاڈمی کی ہے، اس وقت اردو کا کوئی "اسکول" نہیں ہے۔ دہلی اور لکھنؤ اس وقت صرف ایک ایسی وراثت کے دعویدار ہیں جو مدت ہوئی ان کے ہاتھوں سے نکل چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں مقامات کی وہ فضا ہی نہیں رہی جہاں ذوق شعری تربیت پاتا، جہاں طبیعتیں سلجھتی تھیں، زبان کو صیقل ہوتا تھا، نظر میں وسعت اور قلب میں سوز و ساز پیدا ہوتا تھا، لکھنؤ اب بھی غنیمت ہے لیکن یہ چھاؤں بھی ثاقب اور صفی کے دم سے قائم ہے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ اس وقت ایک حد تک دلی نثر کی اور لکھنؤ نظم کی علمبرداری کررہا ہے۔ دارالمصنفین پہ زبان کا نہیں بلکہ علمیت کا رنگ غالب ہے، حیدرآباد سے سرمایہ فراہم کرنے کی توقع ہے۔ اعظم گڑھ اور حیدرآباد کا مقابلہ یوں بھی کیا جاسکتا ہے کہ اول الذکر کی مثال متلاشیان آثار قدیمہ کی ہے جو خزائن اور دفینوں کی تلاش میں ہے۔ اسلاف کے کارناموں کو روشن اور ان سے موجودہ نسل کو آشنا کرنا دارالمصنفین کا کام ہے جن کی جولانگاہ مصر سے کولمبس اور ریاہا پیمائی ہے۔ حیدرآباد خام پیداوار کا مالک ہے اور یہ بمنزلہ ہندوستان کے

ہے آپ اگر معاف فرمائیں تو میں یہ عرض کرونگا کہ دنیا میں بد مذاقوں کی کمی نہیں ہے ممکن ہے لفظ 'خام' سے کچھ لوگ دورانِ تنفس میں مبتلا ہو جائیں اس لئے میں جلد سے جلد یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ لفظ 'خام' سے یہاں 'ناقص' مراد نہیں ہے بلکہ یہ (Raw product) (را پروڈکٹ) کا مرادف ہے۔ اس سلسلہ میں علی گڑھ کو کیا حیثیت دی جائے، میں اب تک طے نہیں کر سکا ہوں اور اسے آپ ہی کے حسنِ تخیل پر چھوڑتا ہوں بشرطیکہ آپ ستم ظریفی کو دخل دینے سے اجتناب فرمائیں۔ یہاں یہ بحث اٹھائی جا سکتی ہے کہ اس اکاڈمی کا مقصد کیا ہوگا اور اس کی ضرورت کیا ہے۔ اس کے متعلق میں یہ عرض کرونگا کہ اس وقت اُردو کو صحیح راستہ پر ڈالنے والی کوئی ایجنسی نہیں ہے۔ رفتارِ زمانہ کے مطابق نئی نئی قوتیں برسرِکار ہیں اور ہر روز نئی نئی ضرورتیں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ اگر کوئی خاص مجلس یا ایجنسی ایسی نہ ہوئی جو ان ضروریات کا تجزیہ کرتی رہے یا مناسب تدابیر پیش کرے تو جیسا کہ آج عام طور پر نظر آ رہا ہے اُردو کی حیثیت صرف نیوز پیپر لٹریچر (اخباری زبان) کی ہو جائے گی اور اس قسم کا لٹریچر جیسا کہ ظاہر ہے، کبھی کلاسکس کے زمرہ میں نہیں آسکتا۔ اُردو کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے، دوسری زبانوں میں نئے الفاظ کے آمیزش کی بہت کم گنجائش ہے لیکن اُردو کا دامن اس کے لئے نہایت وسیع ہے۔ اسماء اور افعال کی آمیزش کچھ بہت زیادہ اہم نہیں ہے یعنی زبان اور محاورہ کے مسئلہ میں ہم کو انتہائی احتیاط برتنی پڑے گی۔ ہندوستان کی حیثیت ایک براعظم کی ہے۔ اس میں سیکڑوں قومیں بستی ہیں اور سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اگر اُردو کی کوئی ٹکسال مقرر نہ کی گئی تو کچھ دنوں میں اس کی صورت کچھ اس طور پر مسخ ہو جانے کا اندیشہ ہے کہ آپ کھرے کھوٹے کا بھی پتا نہ لگا سکیں۔ الفاظ، جملوں، طرزِ انشاء، زبان، لب و لہجہ محاورہ و روزمرہ میں ایسی تفریق نظر آنے لگے گی کہ شاید پھر آپ اُردو کا کوئی محاذ ہی نہ متعین کر سکیں۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ اُردو کے مسلم الثبوت شعراء اور انشاپردازوں کی ایک اکاڈمی قائم کی جائے جو ادب اُردو کا معیار قائم کرے اور دوسرے لوگ اس سے مستفید ہوں۔ میری اگر رائے نہیں تو تمنا ضرور ہے کہ یہ اکاڈمی علی گڑھ میں قائم کی جائے لیکن براہِ راست اُسے مسلم یونیورسٹی سے تعلق نہ ہو، ورنہ انتظامی دقتوں کے علاوہ ممکن ہے ہندوستان کے بہترین دل و دماغ اس کی کامیابی کے لئے مستعد نہ ہوں۔

انسائیکلوپیڈیا

اس سلسلہ میں میں اُردو انسائیکلوپیڈیا کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، ایک زمانہ میں معارف نے اس کی تحریک کی تھی اور اس کے بعد ایک عرصہ تک اس تحریک کی ناکامیابی کا ماتم کیا تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ تحریک اس زمانے میں ایک حد تک قبل از وقت تھی۔ کسی زبان کی انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کا ایک خاص وقت اور موقع ہوتا ہے۔

بہت سے ابتدائی مراحل طے کرنے ہیں اور چونکہ یہ مدارج ابھی ناتمام ہیں اس لئے انسائکلوپیڈیا کی تکمیل کی دشواریاں اور زیادہ سنگین ہوتی جا رہی ہیں۔ انسائکلوپیڈیا کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ وہ جامع اور مکمل ہو۔ اس کے بعد کام کرنے والوں کا سوال آتا ہے۔ کام کرنے والوں کا مسئلہ کچھ بہت زیادہ دشوار نہیں ہے لیکن تحقیق اور تفحص کے اسباب اور وسائل ابھی ناپید ہیں۔ سب سے بڑی ضرورت، اس وقت ایک مکمل اور جامع اُردو لغت کی ہے۔ اب تک جتنی لغات مدوّن ہوئی ہیں وہ بہمہ وجوہ مکمل اور مستند نہیں ہیں۔ یہ اسکیم انسائکلوپیڈیا کی اسکیم سے مختصر اور آسان تر ہے اور اس مرحلہ کے طے ہو جانے کے بعد انسائکلوپیڈیا کی تدوین میں کافی سہولت پیدا ہونے کی توقع ہے۔ اس سلسلہ میں دوسرا ضروری امر یہ ہے کہ مختلف شعبہ جات علوم اور فنون پر مستند اور مکمل تصنیفات کی ضرورت ہے، میں اسے تسلیم کرنے کے لئے طیار ہوں کہ دوسری زبانوں کی کتب کا حوالہ دیا جا سکتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ بعض اوقات وضع اصطلاحات کا مسئلہ اپنی انتہائی پیچیدگیوں کے ساتھ رونما ہوگا اور اس وقت ہم کو ایسے مترادفات کی ضرورت پیش آئے گی جو جامع اور مانع ہونے کے علاوہ ایک حد تک عام فہم اور سہل و رواں بھی ہوں اس معاملہ میں حیدرآباد یونیورسٹی کی کوششیں ہر طور پر قابل ستائش ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے ایک ایسا کام اٹھایا ہے جس کی کامیابی یا ناکامیابی پر اُردو کا مستقبل منحصر ہے۔

اُردو مکاتب

پانچویں ضرورت جس کی طرف خود ہماری ایجوکیشنل کانفرنس کو متوجہ ہونا چاہیئے اُردو مکاتب کا قیام ہے۔ اس سلسلہ میں آپ مجھے اجازت دیں کہ میں کانفرنس کے نظام عمل کی طرف (جہاں تک اُردو کا تعلق ہے) آپ کی توجہ مبذول کراؤں۔ کانفرنس کو اپنے مساعی میں جب کبھی ناکامیابی ہوئی ہے اس کا اصلی راز یہ ہے کہ اس نے اپنا نظام عمل ہمیشہ نہایت وسیع پیمانے پر مرتب کیا، ہندوستان اتنا وسیع ملک ہے کہ اس کی مختلف تعلیمی ضروریات ایک مرکز سے اتمام کو نہیں پہنچ سکتیں۔ کانفرنس کو جزئیات پر نہیں جانا چاہیئے، اس سے سوائے طوالت اور پریشانی کے کچھ اور حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس میں شک نہیں اب پراونشل کانفرنسیں بھی قایم کی گئی ہیں لیکن میرے نزدیک اس میں بھی اختصار کی ضرورت ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ ہر ضلع میں مسلمانوں کی ایک مجلس تعلیمی ہونا چاہیئے جس کے ارکان اور عہدہ دار اسی ضلع کے باشندہ ہوں اور تمام تعلیمی مصارف کا بار خود اسی ضلع پر ہو۔ اس معاملہ میں گورنمنٹ بھی کافی اعانت کرنے پر آمادہ ہے۔ گورنمنٹ کی طرف سے جو مکتب کمیٹیاں قائم ہیں ان کو سب سے بڑی دقت یہ پیش آرہی ہے کہ جن لوگوں کے لئے یہ سب کچھ کیا گیا ہے وہ خود اس کی طرف سے بے اعتنا ہیں۔ میری تجویز یہ ہے کہ کانفرنس کے مقتدر حضرات خود تکلیف فرما کر یا قوم کے دیگر با اثر بزرگوں کے توسل سے، ہر ضلع کا دورہ فرمائیں اور وہاں کے مقامی حالات کو مدنظر رکھکر اس ضلع کے با اثر اور ہمدرد افراد کی حمایت حاصل کریں اور اندرونی انتظامات کی عنان بالکل ان لوگوں کے ہاتھ میں دیدیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر لوگ دل سوزی اور محنت سے کام کریں تو ہر ضلع کے مکاتب اپنی ضروریات کے خود کفیل ہو سکتے ہیں۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ لوگ دلسوزی یا محنت سے کام کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ

اس کے لئے بالعموم غلط اشخاص کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں کے مسلمان فرقہ بندی کی سعادت سے محروم ہوں اور اپنی ذاتی خصومتوں پر قوم و ملک کے بہترین اغراض و مقاصد کو قربان کر دینے کے لئے طیار نہ ہو جاتے ہوں لیکن اگر کوشش کی جائے تو کوئی دقت ایسی نہیں ہے جس پر عبور حاصل نہ ہو سکے اور میرا خیال ہے کہ اگر کانفرنس پوری تندہی کے ساتھ کام کرے تو ممکن نہیں ہے کہ یہ معاملات بر وقت نہ سلجھ جایا کریں۔

حضرات! اس وقت اردو کی اعلیٰ تعلیم کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی ابتدائی تعلیم کی۔ جب تک عوام تعلیم یافتہ نہ ہونگے ہماری آئندہ نسل میں تعلیم کا ذوق فطری اور قومی نہ ہوگا۔ اب ہم کو علمی نہیں بلکہ تعلیمی فضا کی ضرورت ہے اب ضرورت اس کی ہے کہ ہر شخص کم سے کم ابتدائی تعلیم کو، اتنا ہی ضروری سمجھے، جتنا ہمارے گریجویٹ ڈگری حاصل کرنے کے بعد قانون پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کانفرنس کا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ان مکاتب کا نصاب مقرر کرے، ان کا امتحان لے، اور بہترین طریقۂ تعلیم کو عمل پزیر بنائے۔ میری تجویز یہ ہے کہ ان مکاتب کی تعلیم بالکل مفت ہو، اور محض اتنی ہو کہ ہر طالب علم معمولی اردو لکھ پڑھ لے۔ ان مکاتب میں یہ انتظام بھی ہونا چاہیئے کہ ہفتہ میں دو ایک بار رات کے وقت بھی کلاس ہوا کرے تاکہ وہ لوگ (اس میں لڑکوں کی تخصیص نہیں ہے) جو کاروبار کی وجہ سے دن میں تعلیم کا شغل نہ رکھ سکیں، شب میں نوشت و خواند کر لیا کریں۔ استادوں کے انتخاب میں یہ ضروری ہے کہ وہ اسلامی شعائر کا پابند ہو اور ضروری مسائل دینی سے واقف ہوں، ہفتہ یا مہینہ میں ایک بار، اپنے اپنے قصبہ یا قریہ میں لوگوں کو جمع کر کے تعلیم، اسلام اور حفظان صحت پر لکچر دیا کرے۔

اردو گفتگو

ایک اور مسئلہ جس کی طرف میں آپ کی توجہ مائل کرانا چاہتا ہوں یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اردو داں حضرات جب کبھی کسی اردو داں شخص یا پبلک سے مخاطب ہوں اردو ہی میں گفتگو فرمائیں۔ آپ خود ان حضرات سے واقف ہونگے جن کی پوری اردو تقریر میں اردو الفاظ کا تناسب صرف ۱۵ یا ۲۰ فی صدی کا ہوتا ہے۔ یہی حالت خط و کتابت میں بھی نظر آتی ہے۔ بہت کم ایسے انگریزی داں حضرات دیکھے گئے ہیں جو اردو میں خط و کتابت رکھتے ہیں۔ اس کے جواز میں جو دلیل پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس طور پر اظہار خیال میں سہولت ہوتی ہے لیکن میں ان سے سوال کرونگا کہ وہ جب کبھی ایسے شخص اپنا مخاطب بناتے ہیں جو انگریزی سے قطعاً نابلد ہوتا ہے کیا وہ انگریزی کے الفاظ استعمال میں لاتے ہیں اور اگر نہیں لاتے تو کیا اظہار مطالب میں کوئی نقص یا سقم رہ جاتا ہے۔ یہ صفت اکثر ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جو یا تو انگریزی کے تمام مدارج طے کئے ہوتے ہیں یا محض ابجد خواں ہوتے ہیں۔ ایک عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ لوگ جب کبھی اپنے دوستوں یا ڈاکٹروں سے اپنے اعزا کا عموماً اور بیوی کا خصوصاً تذکرہ کرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ (بیوی یا) کچھ اور کہیں ہمیشہ وائف یا سسٹر یا مدر کہیں گے۔ مجھے خود نہیں معلوم اگر بیوی یا ہمشیرہ یا والدہ کہنے سے شرم آتی ہے تو ان الفاظ کے انگریزی جامہ

پہن لینے سے شرم و حیا کا کیا حشر ہوتا ہے۔ یہ بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ امراض کا نام لینے میں بھی اُردو کے بجائے انگریزی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اگر اخفائے حال یا عریانیِ خیال مدِ نظر ہوتی ہے تو میں دریافت کرنا چاہتا ہوں اس سے کہاں تک مقصد برآری ہوتی ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں بے اختیار ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک دن میں ہسپتال میں بیٹھا ہوا تھا، ایک صاحب تشریف لائے۔ ان کی ساری تقریر اُردو میں تھی صرف جہاں کہیں بیوی کا نام آجاتا تھا برابر "وائف" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ میں نے دریافت کیا، کیوں جناب، گستاخی معاف، آپ کی ساری تقریر تو نہایت برہنہ قسم کی اُردو میں تھی، بیوی کو بجائے بیوی کہنے کے آپ "وائف" کیوں فرماتے رہے؟ میرے اس سوال پر انھوں نے کسی قدر تامل کے بعد فرمایا، بات یہ ہے کہ ان کو کچھ فیمیل کمپلینٹس (نسوانی شکایات) ہیں۔ میں نے بے اختیار ہو کر دریافت کیا اور کیوں حضرت فیمیل کمپلینٹس کیا؟ اس کا جواب انھوں نے صرف اس طور پر دیا کہ ڈاکٹر صاحب سے نہایت درجہ مخاطب ہو کر جلد جلد کچھ غیر متعلق باتیں کرنے لگے اور ہمارا سوال اور ان کے فیمیل کمپلینٹس دونوں بیچ میں ختم ہو گئے!

ترجمہ تالیف اور تصنیف

چھٹی ضرورت جو آج ہمارے سامنے ہے وہ ترجمہ اور تالیف کی ہے۔ اس وقت اُردو کو ایسی زبانوں سے مقابلہ کرنا ہے جو شاہراہ ترقی پر اُردو سے بہت آگے پہنچ چکی ہیں۔ اسی سلسلہ میں وضع اصطلاحات کا مسئلہ بھی آجاتا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی اس کام کو نہایت تندہی اور سرعت کے ساتھ پورا کر رہی ہے گو وہاں جن کتابوں کے تراجم اب تک ہو چکے ہیں ان میں بیشتر کتب درسی ہیں اس میں شک نہیں یہ بھی ہمارے انتہائی تشکر و امتنان کا موجب ہے اور اس میں شک نہیں ایک طور پر یہ کوشش بھی مستحسن ہے کیونکہ ہندسہ ریاضی اور فلسفہ وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ لیکن ضرورت یہ ہے کہ مشہور اور مقتدر انشا پرداز ول کی سرپرستی اور نگرانی میں ایک دار الترجمہ قائم ہو جس میں نہ صرف انگریزی بلکہ دیگر زبانوں کے بھی اُردو تراجم مرتب کئے جائیں۔ اس سے زبان کا ذخیرہ نہایت وسیع ہو جائیگا اور وہ لوگ جو صرف اُردو سے آشنا ہیں اور اس میں کمال حاصل کر چکے ہیں۔ دیگر زبانوں کے محاسن اور معائب پر وقوف حاصل کر سکیں گے اور اس طور پر علاوہ اس کے کہ خود اُردو زبان وسیع ہوگی اس کے ہمہ گیر ہونے کا امکان اور زیادہ ترقی کر جائے گا۔ اس مسئلہ خاص میں انجمن ترقی اُردو کی مساعی ہر نوع قابل ستائش ہیں، لیکن جس پر یہ فرض اپنی انتہائی سختیوں کے ساتھ لازم آتا ہے وہ مسلم یونیورسٹی ہے میرا خیال ہے کہ اگر یہاں کے اُردو داں اسٹاف پر فرداً فرداً یہ ذمہ داری عائد کر دی جائے کہ وہ یونیورسٹی کی نگرانی میں اپنے مضمون خاص کی کسی مقتدر تصنیف کو اُردو کے قالب میں لائیں تو شاید بے موقع نہ ہوگا۔

افسانہ نویسی

ساتویں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے وہ دوست اور کرم فرما جن کو اُردو ادب کا ذوق صحیح ہے اور ان کی انشا پردازی ہر حیثیت سے مسلّم ہے، اپنی توجہ کو مختصر افسانہ نویسی اور

اور ناول نگاری کی طرف مائل فرمائیں۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت جب کہ ملک میں ادب متین کی طرف سے انتہائی استغنا برتا جا رہا ہے اور معقول یا غیر معقول اسباب کی بنا پر اُردو ہماری توجہ کو جذب نہیں کر رہی ہے ہمارے انشا پردازوں کو ایسی چیز پیش کرنی چاہیئے جو عوام کے لمحات فرصت کو دلچسپ اور ایک حد تک کارآمد بھی بنا سکے۔ اس وقت ہمارا ادبی ذوق جس حد تک پست ہو چکا ہے اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ اُردو میں سستے اور مبتذل ناول کثرت سے پھیل چکے ہیں اور معمولی لکھا پڑھا آدمی ہمیشہ ان کی طرف مائل ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہی ابتدائی نقوش اس کے علمی اور عملی زندگی دونوں کو ہمیشہ کے لئے برباد کر دیتے ہیں۔ جس قسم کی افسانہ نگاری کا میں نے تذکرہ کیا ہے اس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہے۔ مشرقی معتقدات، مشرقی شعائر، مشرقی تہذیب و تمدن اس صنف انشا کے لئے ہر طور پر راس آسکتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ مشرقی آب و رنگ اس کے لئے نہایت موزوں ہیں لیکن افسانہ نگاری کا فن بجائے خود نہایت مشکل ہے اور اس کے اصول و قواعد کو عمل میں لانا آسان نہیں ہے۔ ان افسانوں اور ناولوں میں مقامی رنگ کا ہونا لازمی ہے ورنہ یہ ہمارے جذبات سے ہم آہنگ نہ ہو سکیں گے۔ غرضکہ اس سلسلہ میں ہم کو نئی بنیاد تعمیر کرنی پڑیگی جس کے لئے ہمارے ماہران ادب کو طیار ہو جانا چاہیئے۔

"اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا"

حضرات! مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا، وہ کر چکا، آپ نے جس صبر و شکر کے ساتھ میرے خیالات کی پذیرائی فرمائی ہے اس کا شکر گزار رہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اب کوئی ایسا موقعہ نہ آئے جہاں میری جسارت اور آپ کے ضبط و تحمل کو یوں معرض امتحان میں لایا جائے۔ صرف ایک چیز باقی رہ گئی ہے جس کا میں نے عمداً کہیں تذکرہ نہیں کیا ہے اور وہ یہ کہ کہنا سننا تو ہمیشہ رہا ہے، اس سے حاصل ہی کیا،

"کچھ کیجئے بھی"

جس اندیشہ سے میں نے اس کا کہیں تذکرہ نہیں کیا وہ آپ پر روشن ہے ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹیٹیوٹ علی گڑھ میں طبع ہوئی ١٣٤٢ھ ١٩٢٤ء